مسلک اعلیٰ حضرت و جمہور علماء اہلسنت کے افکار و نظریات کا ترجمان

الرضا انٹرنیشنل پٹنہ

BIMONTHLY AL-RAZA
(INTERNATIONAL) PATNA

جولائی، اگست ۲۰۲۶ء
JULY, AUGUST 2026

جیل سے باعزت بری ہونے والے مظلوم قیدیوں کی پکار

حکومت سے ایسا قانون بنانے کا مطالبہ جس میں بے گناہوں کو پھنسانے والے مجرموں کو سزا اور مظلوموں کو حقیقی انصاف ملے

مدارس، مساجد، خانقاہوں کی مسماری

اتراکھنڈ: مذہبی تعلیم کا مستقبل اور خدشات!!

مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں کی روک تھام

"عزت بعد ذلت پہ لاکھوں سلام" کا حقیقی مفہوم

- عصر حاضر میں علمائے اہل سنت کی سیاست میں نمائندگی
- عہد وسطیٰ میں مسلم حکمرانوں کی رواداری: ایک جائزہ
- فقہائے متقدمین پہ امام احمد رضا کے تطفلات
- خواجہ معین الدین چشتی اور امام احمد رضا: چند تاریخی حقائق
- قاضی عبد الوحید فردوسی کی علمی خدمات
- قاضی عبد الوحید فردوسی کے چند رفقائے کار
- امام احمد رضا کے حاسدین کی خدمت میں

چیف ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد امجد رضا امجد

بیادگار:
امام اہلسنت سیدنا سرکار اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری
قدس سرہ العزیز

بظل روحانی
حجۃ الاسلام حضرت علامہ الشاہ
محمد حامد رضا خاں قدس سرہ العزیز
مفتی اعظم ہند حضرت علامہ الشاہ
محمد مصطفےٰ رضا نوری قدس سرہ العزیز

بفیض روحانی
جانشین حضور مفتی اعظم ہند تاج الشریعہ حضرت علامہ
الشاہ مفتی اختر رضا خاں قادری رضوی الازہری قدس سرہ العزیز

زیر عاطفت
محدث کبیر حضرت علامہ الحاج الشاہ
ضیاء المصطفیٰ قادری امجدی مدظلہ العالی جامعہ امجدیہ

مسلک اعلیٰ حضرت و جمہور علماء اہلسنت کے افکار و نظریات کا ترجمان

دوماہی الرضا انٹرنیشنل پٹنہ

جلد نمبر ۱۰
شمارہ نمبر ۵۸

Bimonthly AL-RAZA (International) Patna

جولائی، اگست ۲۰۲۶ء July-August 2026

مدیر اعلیٰ:
ڈاکٹر محمد امجد رضا امجد، پٹنہ
مدیر:
احمد رضا صابری، پٹنہ

سر پرست مجلس ادارت
شہزادہ حضور تاج الشریعہ حضرت علامہ عسجد رضا خاں قادری مدظلہ العالی

مجلس ادارت
● مفتی ذوالفقار خان نعیمی ● مولانا بلال انور رضوی مصباحی، جہان آباد ● غلام مصطفیٰ نعیمی دہلی ● مولانا جمال انور رضوی کلیر، جہان آباد ● مولانا قمر الزماں مصباحی ● مولانا سید شاہ عبد القادر جیلانی میاں ممبئی ● مولانا مستقیم احمد رضوی ناگپور ● مولانا ابو محامد غزالی ناگپور ● ڈاکٹر شفیق اجمل قادری بنارس ● مولانا عبد الرحیم نشتر فاروقی ● مولانا قاری نوازش کریم فیضی ● مولانا حماد رضا قادری پٹنہ

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ
دوماہی الرضا انٹرنیشنل، پٹنہ
پتہ: القلم فاؤنڈیشن، گراؤنڈ فلور، جامعہ حضرت فاطمہ
عالم گنج، پٹنہ (بہار) ۸۰۰۰۰۶

Cont. 9835423434 / 8521889323 / 9508881232

Bimonthly AL-RAZA (International) Patna
C/o. AL-QALAM FAOUNDATION
Jamia Hazrat Fatima, Alamganj
Patna - Pin. No. 800006
E-mail: alraza1437@gmail.com

رابطہ: (مدیر اعلیٰ) amjadrazaamjad@gmail.com/9835423434
رابطہ: (مدیر) ahmadrazasabri@gmail.com/ 8521889323

قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، سالانہ ۱۸۰ روپے بیرون ممالک سالانہ ۲۵ امریکی ڈالر

گول دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر سالانہ ختم ہو چکا ہے برائے کرم اپنا زر سالانہ ارسال فرمائیں تاکہ رسالہ بروقت موصول ہو سکے۔

قانونی انتباہ! مضمون نگار کی آرا سے ادارہ ''الرضا'' کا اتفاق ضروری نہیں! کسی بھی مسئلہ میں ادارہ الرضا کا موقف وہی ہے جو اعلیٰ حضرت کا ہے اس کے خلاف اگر کوئی مضمون دھوکہ میں شائع ہو بھی جائے اسے کالعدم سمجھا جائے، کسی بھی طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف پٹنہ کورٹ میں قابل سماعت ہوگی۔

پرنٹر پبلشر احمد رضا صابری ڈائریکٹر احمد پبلیکیشنز (پرائیویٹ لمیٹڈ) نے سبزی باغ سے طبع کر کے دفتر دوماہی الرضا انٹرنیشنل، پٹنہ سے شائع کیا۔

مشمولات

منظومات

* نعتیہ کلام — اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ — 3

اداریہ

* جیل سے باعزت بری ہونے والے مظلوم قیدیوں کی پکار — محمد امجد رضا امجدؔ — 04

تاثرات

* مفتی عابد رضا مصباحی، کولکاتا * مفتی مستقیم احمد رضوی، ناگپور * مفتی دلدار عالم مصباحی ہوڑہ * مولانا محمد عالم رضوی، دہلی * مولانا مشتاق احمد امجدی — 09

آپ کا سوال

* ''عزت بعد ذلت پہ لاکھوں سلام'' کا حقیقی مفہوم — فقیہ النفس مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی — 13

فکر و نظر

عصر حاضر میں علمائے اہل سنت کی سیاست میں نمائندگی — مولانا ملک الظفر سہسرام — 19

* عہد وسطیٰ میں مسلم حکمرانوں کی رواداری: ایک جائزہ — ابرار احمد دہلی — 22

مطالعہ رضویات

* فقہائے متقدمین پہ امام احمد رضا کے تطفلات — علامہ محمد احمد مصباحی — 28
* خواجہ معین الدین چشتی اور امام احمد رضا: چند تاریخی حقائق — مولانا کوثر امام قادری — 35
* حجۃ الاسلام کی نعتیہ شاعری: ایک مطالعہ — مولانا محمد قمر الزماں مصباحی مظفر پوری — 40
* قاضی عبد الوحید فردوسی کی علمی خدمات — ڈاکٹر سید شاہ مظفر الدین بلخی — 44
* قاضی عبد الوحید فردوسی کے رفقائے کار — ڈاکٹر محمد امجد رضا امجدؔ — 47
* امام احمد رضا کے حاسدین کی خدمت میں — مولانا حماد رضا قادری — 52

یادرفتگاں

* حاجی شاہ امداد اللہ چشتی صابری مہاجر مکی — مفتی محمود احمد رفاقتی — 55

سوشل میڈیا کا درپن

* مدارس، مساجد، خانقاہوں کی مسماری — احمد رضا صابری — 58
* اترا کھنڈ: مذہبی تعلیم کا مستقبل اور خدشات!! — غلام مصطفےٰ نعیمی ہاشمی — 61
* بہار میں مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں کی روک تھام — احمد رضا صابری — 63

* * *

منظومات

حسان الہند امام احمد رضا قادری

کس کے جلوے کی جھلک ہے یہ اجالا کیا ہے
ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے

مانگ من مانتی منھ مانگی مرادیں لے گا
نہ یہاں "نا" ہے نہ منگتا سے یہ کہنا "کیا ہے"

پند کڑوی لگے ناصح سے ترش ہوائے نفس
زہرِ عصیاں میں ستمگر تجھے میٹھا کیا ہے

ہم ہیں اُن کے وہ ہیں تیرے تو ہوئے ہم تیرے
اس سے بڑھ کر تری سمت اور وسیلہ کیا ہے

ان کی امّت میں بنایا انھیں رحمت بھیجا
یوں نہ فرما کہ ترا رحم میں دعویٰ کیا ہے

صدقہ پیارے کی حیا کا کہ نہ لے مجھ سے حساب
بخش بے پوچھے لجائے کو لجانا کیا ہے

زاہد اُن کا میں گنہ گار وہ میرے شافع
اتنی نسبت مجھے کیا کم ہے تو سمجھا کیا ہے

بے بسی ہو جو مجھے پرسشِ اعمال کے وقت
دوستو! کیا کہوں اُس وقت تمنّا کیا ہے

کاش فریاد مری سُن کے یہ فرمائیں حضور
ہاں کوئی دیکھو یہ کیا شور ہے غوغا کیا ہے

کون آفت زدہ ہے کس پہ بلا ٹوٹی ہے
کس مصیبت میں گرفتار ہے صدمہ کیا ہے

کس سے کہتا ہے کہ للہ خبر لیجے مری
کیوں ہے بے تاب یہ بے چینی کا رونا کیا ہے

اس کی بے چینی سے ہے خاطرِ اقدس پہ ملال
بے کسی کیسی ہے پوچھو کوئی گزرا کیا ہے

یوں ملائک کریں معروض کہ اِک مجرم ہے
اس سے پرسش ہے بتا تو نے کیا کیا کیا ہے

سامنا قہر کا ہے دفترِ اعمال ہیں پیش
ڈر رہا ہے کہ خدا حکم سناتا کیا ہے

آپ سے کرتا ہے فریاد کہ یا شاہِ رُسل
بندہ بے کس ہے شہا رحم میں وقفہ کیا ہے

اب کوئی دم میں گرفتارِ بلا ہوتا ہوں
آپ آجائیں تو کیا خوف ہے کھٹکا کیا ہے

سُن کے یہ عرض مری بحرِ کرم جوش میں آئے
یوں ملائک کو ہو ارشاد ٹھہرنا کیا ہے

کس کو تم موردِ آفات کیا چاہتے ہو!
ہم بھی تو آکے ذرا دیکھیں تماشا کیا ہے

ان کی آواز پہ کراُٹھوں میں بے ساختہ شور
اور تڑپ کر یہ کہوں اب مجھے پروا کیا ہے

لو وہ آیا مِرا حامی مِرا غم خوارِ اُمَم!
آگئی جاں تنِ بے جاں میں یہ آنا کیا ہے

پھر مجھے دامنِ اقدس میں چھپالیں سَروَر
اور فرمائیں ہٹو اس پہ تقاضا کیا ہے

بندہ آزاد شدہ ہے یہ ہمارے در کا
کیسا لیتے ہو حساب اس پہ تمھارا کیا ہے

چھوڑ کر مجھ کو فرشتے کہیں محکوم ہیں ہم
حکمِ والا کی نہ تعمیل ہو زہرہ کیا ہے

یہ سماں دیکھ کے محشر میں اٹھے شور کہ واہ
چشمِ بد دور ہو کیا شان ہے رتبہ کیا ہے

صدقے اس رحم کے اس سایۂ دامن پہ نثار
اپنے بندے کو مصیبت سے بچایا کیا ہے

اے رضاؔ! جانِ عَنادِل ترے نغموں کے نثار
بلبلِ باغِ مدینہ ترا کہنا کیا ہے

جیل سے باعزت بری ہونے والے مظلوموں کی پکار

حکومت ایسا قانون بنائے جس سے بے گناہوں کو پھنسانے والے مجرموں کو سزا دی جائے

ڈاکٹر محمد امجد رضا امجدؔ
قاضی شریعت مرکزی دار القضا ادارہ شرعیہ بہار پٹنہ

انصاف کسی بھی ملک کی بنیاد اور قانون کی اصل روح ہے یہ اگر زندہ ہے تو ہر شہری کو یہ یقین رہتا ہے کہ اس کی جان، مال، عزت اور آزادی محفوظ ہے، اگر اس پر کوئی الزام عائد بھی ہوگا تو اس کے ساتھ مکمل انصاف کیا جائے گا۔ تمام ممالک میں عدالتوں کا قیام، پولیس کا نظام اور جیلوں کا وجود اسی مقصد کے لیے ہے کہ جرم کی روک تھام ہو، مجرم کو سزا ملے اور بے گناہ ہر حال میں محفوظ رہے۔

غلط گرفتاری اور جھوٹے مقدمات کا سب سے بڑا نقصان صرف ایک فرد تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے اہلِ خانہ کو بھی اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ بچوں کی تعلیم متاثر ہوتی ہے، والدین عمر بھر اذیت میں مبتلا رہتے ہیں اور پورا خاندان معاشرے میں بدنامی کا بوجھ اٹھاتا ہے

اس افسوس ناک صورتِ حال کی بنیادی وجوہات غیر عادلانہ تفتیش، جھوٹے شواہد، غیر ذمہ دارانہ پولیس کاروائی اور مقدمات کے فیصلوں میں غیر معمولی تاخیر شامل ہیں۔ اگر معاملہ کی تفتیش عادلانہ و پیشہ ورانہ معیار کے مطابق ہو، شواہد کی سائنسی بنیادوں پر جانچ کی جائے اور ہر مرحلے پر قانون کی پاسداری یقینی بنائی جائے تو بے گناہوں کے جیل جانے کے امکانات نمایاں طور پر کم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح عدالتوں میں زیرِ التوا مقدمات کی کثرت بھی انصاف میں تاخیر کا ایک بڑا سبب ہے، جبکہ یہ اصول مسلمہ ہے کہ ''تاخیر سے ملا ہوا انصاف، انصاف کا قتل یا ایک طرح کی ناانصافی ہے۔''

ہندوستان کی عدالتی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے کتنے بدنصیب افراد ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے قیمتی ترین سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارے، اور برسوں بعد عدالت نے یہ کہہ کر رہا کر دیا کہ ان کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوسکا۔ قانونی نقطۂ نظر سے یہ ایک فیصلہ ہے، مگر یہ سوچنے کی بات ہے اس فیصلہ سے اس عرصے میں ضائع ہونے والی جوانی، تباہ ہونے والا روزگار، بکھر جانے والا خاندان اور مجروح ہونے والی عزتِ نفس کہاں واپس آسکتی ہے؟ ایسے چند درد کے ماروں سے ملاقات بھی کیجئے جو ان حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔

مظلومیت کی چند مثالیں:

(۱) ۱۹۹۶ء میں دہلی کے لاجپت نگر بلاسٹ اور راجستھان کے سملی پاڑہ بلاسٹ کیس میں محمد علی بھٹ اور لطیف احمد واجا، ان دونوں کشمیری تاجروں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ انہوں نے تقریباً ۲۳ سال جیل میں کاٹے، جس کے دوران ان کے والدین

انتقال کر گئے اوران کا کاروبار مکمل تباہ ہوگیا۔ راجستھان ہائی کورٹ نے ۲۰۱۹ء میں انہیں تمام الزامات سے باعزت بری کرتے ہوئے کہا کہ پراسیکیوشن ان کے خلاف ایک بھی ٹھوس ثبوت یا لنک پیش کرنے میں ناکام رہا۔ عدالت نے دہلی پولیس کی تفتیش پر سخت سوالات اٹھائے اور انہیں باعزت بری کر دیا۔ ۲۳/سال بعد باعزت بری ہونا صرف سننے میں اچھا ہے ورنہ زندگی کا وہ قیمتی حصہ جو سلاخوں کے پیچھے کٹ گیا وہ کہاں سے واپس مل سکتا ہے؟

(۲) سال ۲۰۰۰ء میں محض ایک جھوٹے زمینی تنازع کی وجہ سے درج کرائے گئے کیس میں، اتر پردیش کے لکھیم پور کھیری کے رہنے والے وشنو تیواری کو گرفتار کیا گیا تھا۔ نچلی عدالت نے انہیں عمر قید کی سزا سنادی تھی۔ انہوں نے ۲۰ سال جیل میں گزارے۔ جیل میں رہنے کے دوران ان کے والد اور بھائی کا انتقال ہوگیا اوران کی آخری رسومات میں شامل ہونے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے جنوری ۲۰۲۱ء میں انہیں مکمل طور پر بے گناہ قرار دیتے ہوئے بری کیا۔ عدالت نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ایک بے گناہ نے اپنی زندگی کے ۲۰ سال اس جرم کے لیے جیل میں کاٹے جو اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا'' مگر انصاف تو پوچھتا ہے کہ شفقت کے ان دو میٹھے بولوں سے وہ زخم بھرنے والا ہے جو ۲۰/سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے روتے بلکتے کٹ گئے؟

(۳) نثار الدین احمد (جو کرناٹک میں فارمیسی کے طالب علم تھے) کو ۱۹۹۳ء کے ٹرین بلاسٹ کیس کے سلسلے میں پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ ان پر سنگین دفعات کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ۲۳ سال سلاخوں کے پیچھے گزارے۔ سپریم کورٹ آف انڈیا نے ۲۰۱۶ء میں انہیں باعزت بری کیا۔ سپریم کورٹ نے اپنے تاریخی فیصلے میں کہا کہ نثار الدین کے خلاف کوئی بھی ثبوت موجود نہیں تھا اور پولیس نے قانون کا غلط استعمال کیا۔ نثار الدین نے رہائی کے بعد کہا تھا کہ جب میں جیل گیا تو بیس سال کا نوجوان تھا، جب باہر آیا تو ۴۳ سال کا بوڑھا ہو چکا ہوں، میری زندگی کا سنہرا دور مجھ سے چھین لیا گیا"۔ بتایا جائے کہ جیل میں کاٹے ہوئے ان کی زندگی کے ۲۳ سال کا جواب دہ کون ہے؟

(۴) ۲۰۰۰ء کے دہلی بم دھماکوں کے الزام میں سہیل ملک ۱۲ سال قید میں رہے۔ ۲۰۱۲ء میں دہلی ہائی کورٹ نے عدم ثبوت اور جعلی اعترافی بیانات کی بنیاد پر انہیں باعزت بری کیا۔ ان کی زندگی کے ۱۲/سال ناکردہ جرم کی سزا میں تباہ کردئے گئے، کیا حکومت ان کے ۱۲/سال لوٹا سکتی ہے؟

(۵) ۲۰۰۶ء مالیگاؤں بم دھماکہ کیس میں ڈاکٹر فاروق انصاری، محمد زاہد، اور نذیر احمد سمیت ۹/مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ انہوں نے تقریباً ۵ سے ۱۰/سال جیل میں گزارے۔ ۲۰۱۶ء میں این آئی اے (NIA) اور عدالت نے تسلیم کیا کہ ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے اس لئے ان تمام کو باعزت بری کیا جاتا ہے۔ بتایا جائے بغیر جرم کے ۵/سال جیل کی صعوبتیں جھیلنے والے مظلوموں کا دادرس کون ہے؟ اور یہ کیسا انصاف ہے جو انہیں ۲۰/سال بعد ملا ہے۔

(۶) ممبئی کے رہنے والے ماجد کو دہشت گردی کے ایک مقدمے میں پولیس نے نامزد کیا تھا۔ انہوں نے ۱۹ سال جیل کی تنہائیوں میں گزارے۔ سپریم کورٹ نے ۲۰۲۱ء میں انہیں یہ کہتے ہوئے بری کیا کہ ان کے خلاف کوئی براہِ راست یا بالواسطہ ثبوت موجود نہیں ہے اور محض شک کی بنیاد پر کسی کو اتنی طویل سزا نہیں دی جاسکتی۔ سوال یہ ہے کہ سزا نہیں دینے

کی بات اب رہ کہاں گئی اس نے تو بغیر جرم کے ۱۹ ر سال جیل میں کاٹ لئے؟

(ے) ۲۰۰۲ء میں گجرات کے اکشر دھام مندر پر ہوئے حملے کے الزام میں گجرات پولیس (POTA کورٹ) نے ۱۶ افراد کو گرفتار کیا تھا، جن میں سے تین کو سزائے موت اور دیگر کو عمر قید سنائی گئی تھی۔ ان سبھی نے ۱۱ ر سال سخت ترین سیکیورٹی والی جیل میں کاٹے۔ سپریم کورٹ آف انڈیا نے ۲۰۱۴ء میں تمام ۱۶ افراد کو باعزت بری کر دیا۔ سپریم کورٹ نے تفتیشی ایجنسیوں اور گجرات پولیس کو سخت پھٹکار لگاتے ہوئے کہا کہ پولیس نے معصوم لوگوں کو پھنسانے کے لیے شواہد گھڑے اور بدنیتی کا مظاہرہ کیا۔ مگر کیا اتنا کہہ دینے سے مظلوم کو انصاف مل گیا؟ یا ملزم کو مجرم بنانے والے کی تنبیہ ہو گئی؟ کیا ان پولیس والوں کے خلاف عدالتی کارروائی کرنا مظلوموں پر ہوئے ظلم کا تقاضا نہیں؟

واضح رہے کہ ان تمام مقدمات میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس نے یہ تین اہم نکتے اٹھائے ہیں:

پولیس کے تشدد کے ذریعہ اعترافی بیانات کا زبردستی لیا جانا۔

ثبوت و شواہد کی عدم موجودگی۔

تفتیشی ایجنسیوں کی جانب سے اصل مجرموں کو پکڑنے کے بجائے بے گناہ افراد کو پھنسانا۔

سپریم کورٹ کے اٹھائے ہوئے یہ نکتے بہت اہم ہیں۔ اس میں واضح اشارے دے دئے گئے ہیں کہ ان معاملات میں سب سے بڑے مجرم تفتیشی ایجنسیوں کے عملے ہیں جنھوں نے تشدد، زبردستی اقبالی جرم اور بے گناہ کو مجرم بنانے کا کام کیا اور قانون کی آڑ میں آئین ہند کے آرٹیکل ۲۱ ر کی خلاف ورزی کی۔ یہاں فطری طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب آئین ہند کی خلاف ورزی جرم ہے تو ان پولیس افسران اور تفتیشی ایجنسیوں سے اس جرم کے خلاف مواخذہ کیوں نہیں؟

دوسرا اہم سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ان باعزت بری ہونے والے مظلوم قیدیوں کو انصاف دلانے کا کوئی ضابطہ دستور ہند میں ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ جب جرم پر سزا دینا قانون ہے تو ناکردہ جرم کی سزا پانے والے کو کچھ نہ کچھ ملنا چاہئے یہ آزاد ہندوستان کے ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔

آئینی تحفظات اور قانونی پیچیدگیاں:

دستور ہند کے مطالعہ سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایسا کوئی نظام نہیں کہ مظلوم کو فوراً کوئی سہارا مل جائے۔ ہاں کچھ قوانین ضرور موجود ہیں، جن میں راحت دلانے کی بات کی گئی ہے، مگر ان پر عمل درآمد اتنا مشکل ہے کہ مظلوم کو انصاف ملنا آسان نہیں۔ موجودہ صورت حال کے تعلق سے آئین ہند یہ کہتا ہے کہ:

(۱) مظلوم شخص دستور ہند کے آرٹیکل 21 ر کے تحت ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں رٹ پٹیشن (Writ Petition) دائر کر سکتا ہے۔ ایسی کچھ مثالیں ملتی ہیں کہ کورٹ نے حکومت کو بھاری مالی معاوضہ ادا کرنے کا حکم دیا

(۲) یہ مظلوم شخص ان افراد کے خلاف کورٹ میں حکومت اور ان پولیس افسران یا جھوٹے گواہوں پر مالی نقصان کا دعویٰ کر سکتا ہے جن کی وجہ سے وہ جیل گیا۔

مگر یہ دونوں راستے ان مظلوموں کے لئے آسان نہیں، جو پہلے ہی ۲۰ سال جیل میں کاٹ کر کنگال ہو چکے ہوں، ان کے پاس

ہرجانے کی وصولی کے لیے کئی سال تک مہنگے وکیلوں اور عدالتوں کے چکر کاٹنے کی مالی وجسمانی ہمت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ پھر عام طور پر پولیس افسران کو "حسن نیت" (Good Faith) کے نام پر قانونی تحفظ مل جاتا ہے، جس کی آڑ میں وہ اپنی نااہلی چھپا لیتے ہیں۔

لاءکمیشن کی ۲۷۷ویں رپورٹ اور سفارشات:

قانون کا یہی حساس پہلو تھا جس کے سبب "لا کمیشن آف انڈیا" نے اپنی ۲۷۷ ویں رپورٹ میں Wrongful Prosecution (غلط قانونی چارہ جوئی) کے لیے ایک جامع قانون بنانے کی سفارش کی تھی، جس کی تفصیل یہ بتائی جاتی ہے:

یہ رپورٹ 30 نومبر 2018ء کو لا کمیشن (جس کے چیئر مین اس وقت جسٹس بی ایس چوہان تھے) نے حکومتِ ہند کو پیش کی تھی۔ لاءکمیشن نے سفارش کی کہ بھارت میں اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے کوئی جامع قانونی فریم ورک موجود نہیں ہے، اس لیے ایک مخصوص قانون (Special Legislation) بنایا جائے۔ رپورٹ کی اہم تجاویز یہ ہیں:

(الف) مستقل قانون کا قیام۔۔۔۔۔حکومت کو اب "غلط قانونی چارہ جوئی" کے لیے ایک نیا اور جامع قانون بنانا چاہیے۔

(ب) متاثرہ شخص کو نہ صرف مالی نقصان (ملازمت کا چھوٹنا، عدالتی اخراجات) کا معاوضہ دیا جائے بلکہ اس کی بدنامی، ذہنی اذیت، جسمانی اور نفسیاتی تکلیف کا بھی ازالہ کیا جائے۔ اور معاوضہ طے کرتے وقت اس شخص کی عمر، جیل میں کاٹے گئے وقت، آمدنی کا نقصان، اور سماجی وقار کے متاثر ہونے کو مدنظر رکھا جائے۔

(ج) متاثرہ افراد کی دادرسی کے لیے خاص عدالتیں (Designated Courts/Special Courts) تشکیل دی جائیں تاکہ معاوضے کے مطالبات کا فیصلہ جلد ہی (مثلاً ٦ رماہ کے اندر) ہو سکے۔

(د) جن پولیس افسران یا تفتیشی اداروں کی بدنیتی یا شدید غفلت کی وجہ سے بے گناہ شخص کو قید کی سزا کاٹنی پڑی، ان کے خلاف نہ صرف سزا کی کارروائی کی جائے بلکہ ان پر مجرمانہ مقدمہ (Criminal Prosecution) بھی چلایا جائے۔

(ہ) صرف مالی معاوضہ کافی نہیں ہے، بلکہ متاثرہ شخص کی سماجی بحالی (Social Rehabilitation)، جیسے کہ ملازمت کی بحالی، اور ریاست کی طرف سے عوامی سطح پر معذرت یا نام کی صفائی کی وضاحت کا طریقہ کار بھی ہونا چاہیے۔

لاکمیشن آف انڈیا کی سفارشات بہت اہم اور مظلوموں کی دادرسی کے قریب ہیں۔ اگر یہ قانون بن گیا ہوتا تو یقیناً بے انصافی اور حق تلفی کے بڑھتے رجحان پہ قدغن لگ گیا ہوتا۔ لاکمیشن کا یہ مطالبہ، کسی کی طرف داری نہیں بلکہ یہ آئینِ ہند کے آرٹیکل 21 (زندگی اور ذاتی آزادی کا حق) کے تحت ہے جس میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر شہری کو باوقار زندگی کا حق حاصل ہے اور بے گناہ کو قید کرنا اس بنیادی حق کی شدید خلاف ورزی ہے۔

حکومت ہند سے چند بنیادی مطالبات:

انسانی حقوق اور دنیا بھر کے ترقی یافتہ قوانین کا مطالعہ کرنے کے بعد، حکومت ہند سے یہ مطالبہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اس سنگین مسئلہ کو سلجھانے اور مظلوموں کی دادرسی کے لیے حکومت مندرجہ ذیل امور پر مبنی ایک جامع قانون بنائے:

۱۔ موجودہ نظام میں مظلوم کو رہائی کے بعد معاوضے کے لیے جو قانونی چارہ جوئی کی صلاح دی گئی ہے اسے نئے قانون کے ذریعہ خودکار (Automatic) بنایا جائے۔

۲۔ ایسے بے گناہوں کے باعزت بری ہونے کے فیصلے کے ساتھ معاوضے کی رقم کا تعین بھی ہو جانا چاہیے۔ مثال کے طور

پر، جیل میں گزارے گئے ہر ایک سال کے عوض ایک طے شدہ معقول رقم (جیسے ۱۰ سے ۱۵ لاکھ روپے فی سال) یا اس شخص کی گرفتاری سے قبل کی آمدنی کا دس گنا معاوضہ دیا جائے۔

۳۔ عدالت سے بری ہونے کے بعد ۳۰ دنوں کے اندر حکومت معاوضے کی کم از کم ۲۵ فیصد رقم مظلوم کے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کی پابند ہو، تاکہ وہ فوری طور پر اپنی زندگی کا آغاز کر سکے۔

۴۔ صرف پیسہ کسی انسان کی تباہ شدہ زندگی، سماجی عزت اور ذہنی سکون واپس نہیں لاسکتا۔ اس لیے اس مظلوم کو "سرکاری نوکری" یا کاروبار کے لیے بلاسود قرض دینے کا قانون بنایا جائے۔

۵۔ جب تک وہ شخص جیل میں رہا، اس کی اولاد تعلیم اور صحت سے محروم رہی۔ قانوناً حکومت پر یہ لازم ہو کہ وہ اس کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات خود اٹھائے اور پورے خاندان کو تاحیات مفت طبی سہولیات (Health Insurance) فراہم کرے۔

۶۔ جب تک متعصّبانہ یا غلط تفتیش کرنے والوں کو سزا نہیں ملے گی، تب تک بے گناہوں کو فرضی مقدمات میں پھنسانے کے اس سلسلے پر روک تھام ممکن نہیں ہو سکے گی، اس لئے اگر عدالت پر یہ واضح ہو جائے کہ پولیس افسران یا تفتیشی ایجنسیوں نے جان بوجھ کر ثبوت چھپائے، شواہد گھڑے یا بدنیتی سے کام لیا، تو ایسے افراد کو فوراً نوکری سے برخاست کیا جائے اور ان پر مقدمہ چلا کر اسے کم از کم ۵ / سے ۷ / سال قید کی سزا دی جائے۔

۷۔ مظلوموں کو دیے جانے والے معاوضے کا ایک مخصوص حصہ (مثلاً ۲۰ یا ۳۰ فیصد) اس تفتیشی افسر کی تنخواہ یا پینشن سے کاٹا جائے جس نے جھوٹا کیس بنایا تھا۔ جب پولیس افسر کی اپنی جیب پر آنچ آئے گی، تو وہ کسی بے گناہ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے سو بار سوچیں گے۔

۸۔ عدالت میں جان بوجھ کر جھوٹی گواہی دینے والے شخص کو بھی اسی سزا کا حقدار ٹھہرایا جائے جو سزا اس جھوٹے الزام کی وجہ سے اس بے گناہ ملزم کو ملی۔

ہمارے یہ مطالبات لا کمیشن کے ساتھ اس بین الاقوامی معاہدے ICCPR یعنی International Covenant on Civil and Political Rights کے بھی موافق ہیں جسے ہمارے ملک نے دستخط کر کے تسلیم کیا ہے، جس کے آرٹیکل 14 (6) میں درج ہے کہ غلط سزا پانے والے شخص کو معاوضہ دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔

دنیا کے کئی ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکہ، برطانیہ اور یورپی ممالک میں "غلط سزا کا معاوضہ" (Wrongful Conviction Compensation Law) موجود ہے۔ وہاں اگر کوئی بے گناہ ثابت ہو، تو حکومت خود کار طریقے سے اسے ہر سال کے حساب سے لاکھوں ڈالرز کا معاوضہ، رہائش اور نفسیاتی علاج کی سہولت دیتی ہے۔ مظلوموں کی باز آبادکاری اور ان پر ہوئے مظالم کی بھرپائی کے لئے اپنے یہاں بھی یہ قانون بننا تقاضائے انصاف ہے، جس پر توجہ ہونی چاہئے۔

یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ حقیقی انصاف صرف مجرم کو سزا دینے کا نام نہیں، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی بے گناہ کسی کی غفلت، تعصب یا نااہلی کی وجہ سے ایک دن بھی جیل میں نہ گزارے۔ اگر کسی بے قصور کو برسوں بعد "باعزت بری" قرار دے بھی دیا گیا، تو یہ فیصلہ اس کی بے گناہی کا اعتراف تو ہے، مگر اس کی برباد زندگی کا مکمل ازالہ نہیں۔ قانون وہی ہے جو نہ صرف مجرم کو قانون کے کٹہرے میں لائے بلکہ اپنے نظام پہ حالات کے تناظر میں غور و فکر کرتے ہوئے متاثرین کی عزت، ان کے حقوق اور مستقبل کی بحالی کو بھی یقینی بنائے۔

□□□

قارئین کے تاثرات

قارئین! مداحانہ نہیں، اپنے ناقدانہ وحقیقت پسندانہ تاثرات بھیجیں، یہ مجھے رسالہ کو خوب سے خوب تر بنانے میں معاون ثابت ہو۔

اداریہ بڑا فکر انگیز اور معلومات افزا ہے

مفتی محمد عابد رضا مصباحی
صدر دار الافتا جامع مسجد رائڈ اسٹریٹ کولکاتا

شعر وادب کی زمین، پٹنہ سے شائع ہونے والا، دوماہی الرضا انٹرنیشنل کا مئی جون 2026 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ ماشاءاللہ رسالہ نوع بنوع علمی، فکری اور تحقیقی مضامین سے آراستہ ہے۔

شمارے کی جان اداریہ بڑا فکر انگیز اور معلومات افزا ہے۔ مسلم سلاطین ہند اور موجودہ دور حکومت کے حکمرانوں کا بڑا خوبصورت تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ انتہا پسند اور متعصب ہنود، مسلم سلاطین پر جس انداز سے ہندوؤں پر ظلم کرنے اور ان کے مذہبی مقامات کو توڑنے اور برباد کرنے کا الزام لگاتے ہیں، یہ حقیقت سے بالکل دور اور سراسر بے بنیاد ہے بلکہ مسلم سلاطین نے انسانی جذبے کے تحت تمام باشندگان ملک کے ساتھ یکساں برتاؤ رکھا اور انھوں نے صرف مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی تفریق یا کوئی تشدد نہیں کیا۔

اس کے برعکس آج پوری دنیا دیکھ رہی ہے کہ کس طرح ملک ہند کے حکمران، اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کا استحصال کرر ہے ہیں اور انتظامیہ عدلیہ اور مقننہ سب مل کر سمویدھان کو پس پشت ڈال کر مسلمانوں کے خلاف منصوبے بھی بنا رہے ہیں اور اعلی عدالتی اداروں سے پاس بھی کرر ہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے ظالم بے مروت امن وروا داری سے دوران حکمرانوں کا ماضی کے ان مسلم سلاطین سے کوئی تقابل ہی نہیں ہے۔ واقعۃً اداریہ بڑا زبردست ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے مضامین کو مزید تفصیل کے ساتھ، اردو کے علاوہ ہندی انگریزی اور ملک کی دوسری زبانوں میں، ملک کے بڑے اخبار ورسائل میں شائع کیا جائے، تاکہ حقیقت طشت از بام ہوکر زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔

مناظر اہل سنت، حضرت علامہ مفتی مطیع الرحمن رضوی دام ظلہ کی تحریر انتہائی تحقیقی اور بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے۔ رفع تعارض اور ازالہ شبہات جس خوبصورتی کے ساتھ حضرت نے فرمایا ہے، اس سے فقیہ النفس کی فقہی ممارست وتجربہ اور کمال مہارت بھی آشکارا ہوجاتا ہے۔

استاد گرامی وقار، صدر العلماء حضرت علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ اہل سنت وجماعت کے عظیم محقق ہیں، جس موضوع پر بھی حضرت اقدس کا قلم چلتا ہے حق ادا کردیتے ہیں اور ساتھ ہی اس موضوع پر کام کرنے والوں کو کام کا طریقہ اور نئی راہیں بھی عطا فرمادیتے ہیں۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کی حیات کے ایک اہم گوشہ کو، نظائر وشواہد کی روشنی میں جس خوبصورتی کے ساتھ حضرت نے قلم بند فرمایا ہے وہ حضرت والا ہی کا حصہ ہے۔

مولانا ملک الظفر سہسرامی صاحب ہماری جماعت کے زبردست محرر اور محقق، رواں دواں اور شستہ قلم کے مالک ہیں۔ بندگی کے اخلاص پر اظہار ونمائش جس تیزی کے ساتھ غالب ہو رہا ہے وہ یقینا بڑا لمحۂ فکریہ ہے۔ علامہ سہسرامی صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں امت کو دعوت فکر بھی دی ہے اور

ترغیبِ عمل بھی پیش فرمائی ہے۔

ان سب کے علاوہ مضامین بھی قابل مطالعہ اور لائق تحسین ہیں۔تاہم اس مجموعۂ حسن و دلکشی میں بعض چیزیں وہ بھی نظر آ گئیں جو الرضا جیسے انٹرنیشنل شمارے میں نہیں ہونی چاہیے تھیں، مثلاً قرآن کریم کی آیات کی کتابت/کمپوزنگ میں کئی غلطیاں رہ گئی ہیں، کئی جگہ ہمزہ کا اضافہ ہو گیا ہے جو قرآن کریم میں مرسوم نہیں ہے۔قران کریم بہر حال رسم خط عثمانی میں ہی لکھا جانا چاہئے اور کتابت و پروف میں تو اس پر خصوصی نظر ہونی چاہیے۔اس کے علاوہ اردو کے الفاظ میں بھی بہت جگہ پروف کی کمی رہ گئی ہے، خود ہیڈنگ میں ہی فتاوی رضویہ میں فتاوی سے واؤ غائب ہو گیا ہے۔دوسری چیز املا کے قواعد میں بھی حتی الوسع جدید رسم الخط کا ہی اہتمام ہونا چاہیے۔

قابل مبارک باد ہیں مدیر اعلیٰ حضرت ڈاکٹر امجد رضا امجد صاحب اور آپ کی پوری ٹیم جو ''الرضا'' کے ذریعے سے اعلیٰ حضرت امام اہل سنت امام احمد رضا قادری قدس سرہ کی تعلیمات کی روشنی میں، اسلامی افکار و نظریات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ اللہ رب العالمین الرضا کو خوب رفعت عطا فرمائے۔

□□□

الرضا اہل سنت کا سچا اور علمی نقیب ہے

مفتی محمد مستقیم احمد رضوی
بانی: دار العلوم گلشن بغدادنا گپور

دوماہی مجلہ "الرضا انٹرنیشنل" (پٹنہ، شمارہ مئی-جون 2026ء) کا تفصیلی مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ یہ جریدہ علمی، فقہی اور فکری میدان میں قارئین کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ مجلّے کا اداریہ "مسلم سلاطینِ ہند اور موجودہ دورِ حکومت: ایک تقابلی جائزہ" معارف اور تاریخی حقائق کا زبردست مرقع ہے۔ ڈاکٹر محمد امجد رضا امجد صاحب نے جس تدبر، جرات اور تاریخی شواہد کی روشنی میں مسلم حکمرانوں کے دورِ حکومت کی رواداری اور موجودہ دور کے تعصّبات کا موازنہ کیا ہے، وہ چشم کشا ہے۔خاص طور پر سلطان غیاث الدین تغلق اور قاضیِ وقت کی عدالت کے واقعے نے یہ ثابت کر دیا کہ ماضی میں عدل و انصاف کی حکمرانی کا کیا معیار تھا۔یہ تحریر نہ صرف بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ ہے بلکہ موجودہ نظام کے لیے ایک بیدار کن پیغام بھی ہے۔

مجلّے کے تحقیقی مضامین میں علمی و فقہی تنوع عروج پر ہے۔ مفتی مطیع الرحمن رضوی صاحب کا مقالہ "کیا فتاویٰ رضویہ اور بہارِ شریعت میں تعارض ہے؟" ان کی گہری فقہی بصیرت اور علمی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔انہوں نے جس باریک بینی سے دونوں عظیم فتاویٰ کی ہم آہنگی کو ثابت کیا ہے، اس سے اہل علم کے لیے فکر کے نئے در وا ہوئے ہیں۔اسی طرح علامہ محمد احمد مصباحی صاحب کی نگارش "علامہ فضلِ حق خیرآبادی: عظیم فلسفی یا زبردست اسلامی متکلم؟" علم و تحقیق کا اعلیٰ شاہکار ہے۔انہوں نے فلسفہ و کلام کے بحرِ زخار سے جن گوہر ہائے گراں مایہ کو چن کر پیش کیا ہے، وہ علامہ خیرآبادی کی نابغہ روزگار شخصیت کو صحیح معنوں میں خراجِ تحسین ہے۔

اس شمارے کا ایک اور قابلِ قدر اور اہم ترین گوشہ مستقل کالم "سوشل میڈیا کا درپن" ہے۔موجودہ دور میں جہاں ڈیجیٹل ذرائع ابلاغ نے اخلاقی اور فکری قدروں کو پامال کر رکھا ہے، اس کالم کے ذریعے سوشل میڈیا پر پھیلی بے راہ روی، جھوٹی افواہوں اور غیر ذمہ دارانہ رویوں کا جس سنجیدگی سے محاسبہ کیا گیا ہے، وہ انتہائی لائقِ تحسین ہے۔یہ کالم نوجوان نسل کو آئندہ کے لیے ذمہ دارانہ اور تعمیری استعمال کی ہدایت دیتا ہے۔

مجلّے کا سرورق، معیاری طباعت اور مضامین کی ہمہ جہتی اس بات کا ثبوت ہے کہ ادارہ محنت اور خلوص کے ساتھ علمی خدمت

انجام دے رہا ہے۔ میری طرف سے مدیرِ اعلیٰ اور پوری مجلسِ ادارت کو مبارکباد!

□□□

علمی شاہکار اور عصرِ حاضر کے فکری چیلنجز

مفتی دلدار عالم مصباحی
دار العلوم ضیاء الاسلام ٹکیہ پارہ، ہوڑہ بنگال

دوماہی "الرضا انٹرنیشنل" پٹنہ کا حالیہ شمارہ (مئی-جون 2026ء) نظر سے گزرا۔ مجلّے کو دیکھ کر یہ خوشگوار احساس ہوا کہ برصغیر میں علمی و تحقیقی صحافت کا معیار اب بھی بلند اور معتبر ہاتھوں میں ہے۔ مجلّے کا اداریہ محض ایک سیاسی یا تحریری تبصرہ نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلم سلاطین کے عہدِ زریں میں قائم کردہ عدل وانصاف اور سماجی رواداری کا موازنہ جب موجودہ دور کے تعصّبات سے کیا جاتا ہے تو حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ مدیرِ اعلیٰ نے تاریخ کے مستند حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ مسلمان حکمرانوں نے مساوات اور بلا تفریقِ مذہب وملت انصاف کی جو اعلیٰ روایتیں قائم کی تھیں، وہ آج کے نام نہاد جمہوری نظام کے لیے بھی مشعلِ راہ ہیں۔

علمی مضامین کی نشست میں علامہ محمد احمد مصباحی صاحب کا تحریر کردہ مضمون بالخصوص لائقِ مطالعہ ہے۔ علامہ فضلِ حق خیر آبادی کی فکری جولانیوں، یونانی فلسفے پر ان کی ناقدانہ نگاہ اور علمِ کلام میں ان کے مقام و مرتبے کو علامہ مصباحی صاحب نے جس سائنسی اور استدلالی انداز میں پیش کیا ہے، وہ تحسین سے بالاتر ہے۔ وہیں دوسری طرف مفتی مطیع الرحمن رضوی صاحب نے فتاویٰ رضویہ اور بہارِ شریعت کے تعارض کے مفروضے کو جس منطقی اور شرعی انداز سے رد کیا ہے، اس نے علمی حلقوں میں پائے جانے والے کئی مغالطوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ طلبہ اور علما دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

مجلّے کا مستقل کالم "سوشل میڈیا کا درپن" عصرِ حاضر کے نازک مسائل پر گہری نظر رکھتا ہے۔ آج جب سوشل میڈیا کا استعمال محض وقت کے ضیاع اور نظریاتی گمراہی کا سبب بن رہا ہے، اس کالم نے شیشے کی طرح معاشرے کی خامیاں سامنے لا کھڑی کی ہیں۔ کالم نگار نے جس انداز میں اصلاحی اور تربیتی زاویہ اختیار کیا ہے، وہ قارئین کو خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے۔ یہ جریدہ نہ صرف قدیم علمی اثاثے کی حفاظت کر رہا ہے بلکہ عصری مسائل کا ادراک رکھتے ہوئے صحیح سمت میں رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دے رہا ہے۔

□□□

فکری تجدید، علمی و روحانی بالیدگی کا روشن مینار

مفتی محمد عالم رضوی، دہلی

"الرضا انٹرنیشنل" (مئی-جون 2026ء) کا نیا شمارہ موصول ہوا، جسے اول تا آخر پڑھنے کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ صرف ایک رسالہ نہیں بلکہ علمی و فکری تحریک کا نام ہے۔

مجلّے کا اداریہ مسلم حکمرانوں اور موجودہ دور کے سیاسی و سماجی حالات کا احاطہ کرتے ہوئے نہایت جرات مندانہ انداز میں رقم کیا گیا ہے۔ تاریخ کے سچے واقعات بالخصوص عدالتی نظام کی آزادی اور غیاث الدین تغلق کے واقعے کو سامنے لا کر مدیرِ اعلیٰ نے ثابت کیا کہ اسلام کا سیاسی و عدالتی نظام کتنا غیر جانبدارانہ تھا۔ یہ تحریر بلاشبہ مسلم معاشرے کے لیے باعثِ فخر اور موجودہ اربابِ اقتدار کے لیے آئینہ ہے۔

شمارے کو بلندی عطا کرنے میں مفتی مطیع الرحمن رضوی صاحب اور علامہ محمد احمد مصباحی صاحب کے مضامین کا بنیادی کردار ہے۔ مفتی مطیع الرحمن رضوی صاحب کا مقالہ فتاویٰ رضویہ اور بہارِ شریعت کے عدمِ تعارض پر ایک تاریخی اور فقہی شاہکار ہے، جس نے فتویٰ نویسی کے اصولوں کو مزید اجاگر کیا

ہے۔ دوسری جانب علامہ محمد احمد مصباحی صاحب نے علامہ فضلِ حق خیر آبادی کی شخصیت کے علمی وفلسفیانہ گوشوں کو اس خوبصورتی سے واشگاف کیا ہے کہ قاری ان کی علمی ہیبت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دونوں تحریریں رسالے کے معیار کو ایک خاص وقار بخشتی ہیں۔

الغرض، الرضا انٹرنیشنل کا یہ شمارہ مواد، ترتیب، اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے ایک مکمل اور شاندار دستاویز ہے جس کے لیے پوری ادارتی ٹیم داد کی مستحق ہے۔

□□□

جامعیت وکمالات سے پر اداریہ

قابل تکریم واحترام ڈاکٹر امجد رضا صاحب زید مجدہ

..........سلام مسنون

عوافی مزاج

ایک طویل زمانہ کے بعد آج واٹس ایپ پر ''دوماہی الرضا انٹرنیشنل'' کا شمارہ مئی ،جون ۲۰۲۶ء باصرہ نواز ہوا،طویل وقفہ گزرنے کے بعد بھی اس جریدہ میں وہی رنگ وآہنگ، وہی لطافت ونزاکت اور وہی حلاوت وشیرینی پایا جو بہت پہلے محسوس کرتا تھا، جو اس دوماہی رسالہ کی شان انفرادیت اور نشان امتیازیت ہے۔

یوں تو اس مجلہ کے تمام کالم اور ان میں درج عناوین بیش قیمت اور لائق مطالعہ ہیں مگر بطور خاص اس شمارے کا آپ کا فکر انگیز اداریہ **''مسلمین ہند اور موجودہ حکومت: ایک تنقیدی جائزہ''** کا مطالعہ اس احساس کو تازہ کر دیتا ہے کہ قلم جب دیانت، بصیرت اور دردِ ملت سے آشنا ہو تو اداریہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں رہتا بلکہ قوم کے شعور کو بیدار کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ آپ نے جذباتیت سے گریز کرتے ہوئے دلیل، تاریخ اور زمینی حقائق کی روشنی میں نہایت متوازن انداز سے اپنے موقف کو پیش کیا ہے، جو قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

اداریہ کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں مسائل کی صرف نشاندہی نہ کی گئی ہو بلکہ ان کے اسباب، نتائج اور ممکنہ حل کی طرف بھی سنجیدہ رہنمائی کی گئی ہو۔، دیگر اداریوں کی طرح یہ اداریہ بھی مذکورہ خوبی سے مملو ومشحون ہے، اس اداریہ میں قومی حالات، آئینی اقدار، جمہوری روایات اور مسلم معاشرے کی ذمہ داریوں کو جس ربط اور فکری گہرائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، وہ آپ کے وسیع مطالعہ، بالغ نظری اور حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر کا واضح ثبوت ہے۔ اسلوب شائستہ، استدلال مضبوط اور لہجہ مؤثر ہے، جو اداریے کی علمی وقعت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

یہ اداریہ دراصل محض ایک سیاسی تبصرہ نہیں بلکہ اہلِ وطن، بالخصوص مسلمانوں کے لیے ایک فکری دستاویز اور دعوتِ احتساب ہے۔ اس میں اختلاف کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے حق گوئی، آئینی شعور، ملی اتحاد اور اجتماعی ذمہ داری کا ایسا پیغام دیا گیا ہے جو ہر صاحبِ فکر کے لیے قابلِ توجہ ہے۔ ایسے اداریے صحافت کو محض خبر رسانی کے دائرے سے نکال کر فکری و تہذیبی رہنمائی کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔

بلاشبہ دوماہی انٹرنیشنل کا یہ اداریہ اپنے موضوع، اسلوب اور فکری توازن کے اعتبار سے نہایت وقیع اور قابلِ مطالعہ ہے۔ امید ہے کہ یہ تحریر اہلِ علم، دانشوروں اور نوجوان نسل میں بیداریِ فکر، اعتدالِ نظر اور مثبت اجتماعی کردار کے فروغ کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوگی، اور اردو صحافت کی سنجیدہ علمی روایت میں ایک اہم اضافہ شمار کی جائے گی۔

خیر اندیش

ابوالاختر مشتاق احمد امجدی غفرلہ

خادم: درس وافتا، ازہری دارالافتاء، ناسک

وارد حال مرکز اہل سنت بریلی شریف

□□□

آپ کا سوال

الرضا انٹرنیشنل کا ایک علمی فقہی سلسلہ ''آپ کا سوال''

عزت بعد ذلت پہ لاکھوں سلام

جوابات: مناظر اہل سنت فقیہ النفس حضرت مفتی محمد مطیع الرحمن رضوی مدظلہ
بانی وسربراہ: جامعہ نوریہ شام پور، رائے گنج، بنگال

نعمۃ القدس، فقیہ النفس حضور مفتی صاحب قبلہ دام ظلکم علینا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ''سلام'' کے ایک شعر میں لکھا ہے:

کثرتِ بعدِ قلت پہ اکثر درود
عزتِ بعدِ ذلت پہ لاکھوں سلام

کچھ لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت نے اس شعر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ذلت کے بعد عزت ملنے کی بات کہی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ پہلے ذلیل تھے بعد میں آپ کو عزت ملی۔ اس میں تو درود وسلام کی آڑ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی گئی ہے۔ اس کا جواب عنایت فرمائیں!

حماد رضا قادری
مہتمم جامعہ حضرت فاطمہ عالم گنج پٹنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الجواب

وکم من عائب قولا صحیحاً
وآفته من الفهم السقیم
چشم بداندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش درنظر

جواب تو اُس اعتراض کا ہو جو کسی بھی معنی میں اعتراض ہو۔ یہ تو سراسر مہمل اور جہالت یا تعصب، بلکہ دونوں کی مخلوط پیداوار ہے۔ وہ شعر جس کے ایک ایک لفظ سے رسول کائنات کی تعریف وتوصیف کے چشمے ابلتے اور مدحت وستائش کے پھول کھلتے ہیں۔ جو حد درجہ ایجاز واختصار کے ساتھ اپنے اندر کفر کی ہزیمت اور اسلام کی زریں تاریخ لیے، علم بیان وبدیع کا ایک جہان سمیٹے ہوئے ہے، اسے سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تنقیص وتوہین کا مرادف قرار دینا، کیا اعتراض کہلا سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ایسے اعتراض کرنے والوں کو جنون سے شفا دے کر ہدایت نصیب فرمائے!

بہر حال ایسے لوگوں کی لب دوزی تو کسی طرح سے ہو سکتی ہے۔ لیکن فقیر نہ اپنی سطح سے نیچے آنا مناسب سمجھتا ہے اور نہ ہی اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا۔ اس لیے پڑھے لکھے غیر متعصب حضرات کی عدالت میں ایک مختصر سی عرضداشت پیش کر کے فیصلہ ان پر چھوڑتا ہے۔

امام احمد رضا کوئی عام سے مولوی نہیں، بلکہ قدیم وجدید علوم وفنون کی سو سے زائد شاخوں پر عظیم ملکہ رکھنے والے وقت کے فقید المثال متکلم وفقیہ، امام الکلام اور ایسے نعت گو صوفی شاعر تھے، جنہوں نے نعت گوئی قرآن کریم سے سیکھی تھی۔

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

اور بارگاہ نبوت کے شاعر حضرت حسان رضی اللہ عنہ، جن

کے بارے میں سرکار رسالت کی یہ دعا تھی: اللھم ایدہ بروح القدس • (اے اللہ روح القدس کے ذریعہ اس کی مدد فرما) اُن کو اِس راہ کا رہنما اور ہبر مان کر انھیں کی تقلید و پیروی کرتے ہوئے گلہائے نعت پیش کیے:

رہبر کی رہِ نعت میں گر حاجت ہو
نقش قدم حضرتِ حسان بس ہے

قرآنی حکم: ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی یاایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ کی تعمیل میں جب آپ نے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ہدیۂ سلام پیش کرنا شروع کیا تو اس کے لیے شاعری کی مختلف اصناف: مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ، قصیدہ وغیرہ میں سے صنف قصیدہ کا انتخاب کیا اور ایک سو ستر اشعار پر مشتمل بے مثال قصیدہ سلامیہ لکھا۔

قصیدہ جب مدحیہ ہو تو اس کا آغاز کبھی تشبیب سے ہوتا ہے اور کبھی براہ راست ممدوح کی مدح سے بھی۔ پھر مدح میں بھی کبھی ممدوح کے اوصاف خارجیہ کا بیان ہوتا ہے، کبھی اوصاف داخلیہ کا۔ اوصاف خارجیہ کے بیان میں ممدوح کے متعلقات کو بھی بیان کیا جاتا ہے اور اوصاف داخلیہ کے بیان میں سراپا نگاری ہو تو یہ بڑے کمال کی چیز ہو جاتی ہے۔

امام احمد رضا کے قصیدہ مدحیہ سلامیہ میں اُن کا ممدوح وہ ہے جو خود خلاق کائنات کا ممدوح ہے، اس نے ازل میں نظم و نثر سے ماورا اپنے کلام قدیم کے اندر اپنے ممدوح کی شان میں جو معنوی قصیدہ کہا ہے اس میں آپ کے سراپا کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

رخ انور کو "والضحی" گیسوئے عنبریں کو "واللیل اذا سجی"، سیر فرمانے کو "سبحان الذی أسری" پلکیں جھپکائے بغیر محوِ دید رہنے کو "ما زاغ البصر وما طغی"، لوٹ آنے کو "والنجم اذا ھوی"، ہاتھ سے خاک پھینکنے کو "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی"، قیام فرمانے کو "وانت حل بھذا البلد"، نگاہیں اُٹھا کر آسمان کی طرف تکنے کو "قد نری تقلب وجھك فی السماء"، پیشانی پر بل آ جانے کو "عبس وتولی" چادر اوڑھ لینے کو "یاایھا المدثر"، جسم اقدس پر بالا پوش ڈال کر سو جانے کو "یاایھا المزمل" اور تکلم فرمانے کو "وقیلہ یٰرب" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اخیر میں خلاصے کے طور پر "وأتممت علیکم نعمتی" فرما کر مُہر شاہی ثبت کر دی ہے۔ گویا حضرت محقق دہلوی کے لفظوں میں:

ہر رتبہ کہ بود در امکاں بروست ختم
ہر نعمتے کہ داشت خدا بروشد تمام

اسی سے اخذ کرتے ہوئے امام احمد رضا نے اپنے قصیدۂ سلامیہ کا خمیر گوندھا، تو قرآنی ترتیب کے مطابق پہلے قصیدۂ درودیہ

کعبہ کے بدر الدجی تم پہ کروروں درود
طیبہ کے شمس الضحی تم پہ کروروں درود

لکھا، اس سے فراغ ہوا تو قصیدۂ سلامیہ کا آغاز کیا اور مطلع عرض فرمایا:

مصطفی جان رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام

اسی کے پچیسویں شعر میں فرمایا:

کثرت بعدِ قلت پہ اکثر درود
عزت بعدِ ذلت پہ لاکھوں سلام

"کثرت" کے معنی مطلق "زیادتی" کے ہیں خواہ مقدار میں زیادتی ہو، یا تعداد میں زیاتی ہو، اور خواہ کیفیت میں زیادتی ہو۔ اور یہ ایک اضافی امر ہے۔

اسی طرح "قلت" بھی ایک اضافی امر ہے جس کے معنی مطلقاً "کمی" کے ہیں خواہ مقدار کی کمی ہو، یا افراد کی کمی ہو، اور خواہ اسباب کی کمی ہو۔

"عزت" کے معنی غلبہ اور مقام و مرتبہ کے ہیں، یہ لفظ قرآن میں اکثر مقامات پر اسی معنی میں آیا ہے، اور یہ بھی ایک اضافی امر ہے۔
اسی طرح "ذلت" بھی ایک اضافی امر ہے جس کے معنی

کمزوری'، 'نرمی'، اور 'بے سروسامانی' کے ہیں۔ قرآن کریم، سورہ اسراء، آیت ۱۱۱ میں ہے:

ولم یکن لہ شریک فی الملك ولم یکن له ولی من الذل۔

ترجمہ: بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں اور کمزوری کی وجہ سے کوئی اس کا حمایتی نہیں۔

سورہ مائدہ، آیت ۵۴ میں ہے:

یایها الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینه فسوف یأتی الله بقوم یحبه ویحبونه أذلة علی المؤمنین أعزة علی الکافرین۔

ترجمہ: اے ایمان والو! تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ عنقریب ایسے لوگوں کو لائے گا جو اللہ کے پیارے اور اللہ ان کا پیارا، مسلمانوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہوں گے۔

سورہ آل عمران، آیت ۱۲۳ میں ہے:

ولقد نصر کم الله ببدر و انتم أذلة۔
[آل عمران / ۱۲۳]

ترجمہ: اور بے شک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم بالکل بے سروسامان تھے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ جن الفاظ کے معنی متعدد ہو سکتے ہوں، ان کے معنی موقع ومحل اور نسبت وتعلق کے اعتبار سے متعین کیے جاتے ہیں، مثلاً عربی لفظ "تحت"، فارسی لفظ "زیر" انگریزی لفظ "Under" کے معنی موقع ومحل اور نسبت وتعلق کا اعتبار کئے بغیر متعین نہیں کئے جا سکتے ورنہ کہیں کی بات کہیں جا پہنچے گی۔

وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ نسبت کی دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقی نسبت، جیسے: سوکھا کنواں؛ کیوں کہ حقیقتاً کنواں ہی سوکھا ہوا ہوتا ہے۔ (۲) مجازی نسبت، جیسے: بہتی ندی، کیوں کہ حقیقتاً تو پانی بہ رہا ہے مگر مجازاً بہنے کی نسبت ندی کی طرف کردی جاتی ہے ــــ بطور نمونہ نسبت مجازی کی چند قسمیں اور ان کی مثالیں قرآن کریم سے بھی ملاحظہ ہوں:

(۱) نسبت زمانی، جیسے: "فکیف تتقون إن کفرتم یوما یجعل الولدان شیبا۔" (پھر کیسے بچو گے اگر کفر کرو اس دن سے جو بچوں کو بوڑھا کردے گا۔) یہاں بچوں کو بوڑھا کردینے کی نسبت دن کی طرف کی گئی ہے۔

(۲) نسبت مکانی، جیسے: "و أخرجت الأرض أثقالها۔" (اور زمین اپنے بوجھ باہر پھینک دے) یہاں باہر پھینکنے کی نسبت زمین کی طرف کی گئی ہے ــــ "جنّٰت تجری من تحتها الأنهٰر۔" (ایسی جنتیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں) یہاں جاری ہونے کی نسبت نہر کی طرف کی گئی ہے۔

(۳) نسبت سببی، جیسے: "یذبح أبناءهم" (فرعون بنی اسرائل کے بچوں کو ذبح کرتا) یہاں بچوں کے ذبح کرنے کی نسبت فوج کی بجائے فرعون کی طرف کی گئی ہے ــــ "ینزع عنهما لباسهما۔ (شیطان نے اتار دیے ان کے لباس) یہاں لباس اتار دینے کی نسبت ابلیس کی طرف کی گئی ہے۔

امام سعد الدین تفتازانی علیہ الرحمہ نے مختصر المعانی، ص: ۵۹ میں موخر الذکر دونوں آیتوں کے تعلق سے فرمایا ہے:

"یذبح أبناءهم" نسب التذبیح الذی هو فعل الجیش إلی فرعون؛ لأنه سبب آمر "ینزع عنهما لباسهما۔" نسب نزع اللباس عن آدم و حوا علی نبینا و علیهما السلام و هو فعل الله تعالی، إلی إبلیس؛ لأن سببه الأکل من الشجرة، و سبب الأکل وسوسته و مقاسمته إیاهما بأنه لهما من الناصحین۔

ترجمہ: "یذبح ابناءهم" میں ذبح کرنا جو فرعون کی فوج کا کام تھا، اس کی نسبت

فرعون کی طرف اس لیے کردی گئی ہے؛ کیوں کہ حکم دینے والا سبب وہی ہے۔اور ''ینزع عنهما لباسهما''۔میں حضرت آدم وحواعلی نبینا وعلیہما السلام سے لباس اتارلیناجواللہ تعالی کا فعل ہے ،اس کی نسبت ابلیس کی طرف کی گئی اس لیے کہ لباس اتارنے کا سبب ممنوعہ درخت کا پھل کھانا ہے۔ اور پھل کھانے کا سبب ابلیس کا ورغلانا اوران دونوں سے قسم کھا کر یہ کہنا ہے کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

اردو کی عام بول چال میں بھی کہا جاتا ہے کہ آگرہ کا تاج محل اوردہلی کا لال قلعہ دونوں شہنشاہ شاہ جہاں کے بنائے ہوئے ہیں۔حالاں کہ تاج محل ہو یا لال قلعہ،شاہ جہاں نے نہیں ، بلکہ مزدوروں نے بنایا ہے۔مگر شاہجہاں چوں کہ تاج محل اور لال قلعہ بنانے کا سبب ہے اس لیے ان کے بنانے کی نسبت شاہجہاں کی طرف صحیح ہے۔

قرآن کریم میں نسبت سببی ہی کی یہ مثال بھی دیکھ لیجیے: ''فأزلهما الشيطان عنها۔ (تو شیطان نے جنت سے انھیں لغزش دی۔)

اس آیت کے تحت شیخ زادہ علی البیضاوی میں ہے:

إنهامن قبيل اضافة الفعل إلى من حصل بسببه الداعية التى تحمل الفاعل على الفعل؛ فإن القادر على الفعل والترك مع التساوى يستحيل أن يكون مو جدا لأحد الطرفين إلا عندانضمام الداعى إليه،والداعى فى حق العبدعبارة عن علم أوظن أواعتقاد،لكون الفعل مشتملاً على المصلحة،فإذاحصل العلم أوالظن بسبب منبه نبه عليه جاز إضافة الفعل إلى ذلك المنبِّه من حيث كونه سبباً لحصول تلك الداعية التى لأجلها صار الفاعل فاعلاً (ص: ۲۶۴)

ترجمہ: یہ نسبت اس نسبت کے قبیل سے ہے جس میں فاعل کے لیے فعل کا داعیہ جس سبب سے پیدا ہوتا ہے اسی کی طرف کردی جاتی ہے؛ کیوں کہ فاعل جب کسی کام کے کرنے ،نہ کرنے دونوں پر مساوی انداز میں قادر ہو تو بغیر کسی سبب کے کسی ایک جہت کو اپنا لینا محال ہے ۔اور فعل چوں کہ مصلحت پر مبنی ہوتا ہے اس لیے بندے کے حق میں وہ داعیہ علم یا ظن یا اعتقاد ہوتا ہے۔اور جب وہ علم یاظن یا اعتقاد کسی تنبیہ کرنے والے کی تنبیہ کی وجہ سے حاصل ہو، تو فعل کی نسبت اس تنبیہ کرنے والے کی طرف کرنا درست ہے؛ کیوں کہ وہ تنبیہ کرنے والا اس داعیہ کے حصول کا سبب ہوتا ہے جس کی وجہ سے فاعل، فعل کا فاعل بنتا ہے۔

''استقامت''،ختم ہوکر''زلت'' کا حصول حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو ہوا،جس کا داعیہ اُن کا یہ ظن ہوا کہ درخت کا پھل کھا لینے سے جنت کی سکونت دوامی ہوجائے گی، اوران کو یہ ظن شیطان کے قسم کھا کر کہنے سے ہوا۔اس لیے قرآن کریم میں''ازلال'' کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ــــــ غرض کہ حکم کی نسبت فعل کے داعیہ کے سبب کی طرف اس نسبت قرآنی کی روشنی میں بالکل صحیح ودرست ہے۔

اب اس تناظر میں امام احمد رضا کے سلامیہ قصیدہ کے اس پچیسویں شعر کو دیکھیے:

کثرتِ بعد قلت پہ اکثر درود
عزتِ بعد ذلت پہ لاکھوں سلام

حسانِ وقت امام احمد رضا نے 'قلت' کے بعد 'کثرت' اور 'ذلت' کے بعد 'عزت' صرف ان چار لفظوں میں نہایت ہی ایجاز واختصار کے ساتھ تلمیح کے طور پر ما قبل اسلام سے لے کر حجۃ الوداع

تک کا ہی نقشہ نہیں، ابد تک کا پورا منظر ہمارے سامنے کر دیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے اور ''لقد کرمنا بنی آدم'' کا تاج زریں رکھنے کے باوجود جہالت وگمراہی کی حدیں پھلانگ کر قعر مذلت میں یہاں تک گر چکے تھے کہ جانور بھی ان سے شرمندہ تھے۔''لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم أعين لا يبصرون بها ،ولهم آذان لا يسمعون بها ، أولئك كالأنعام بل هم أضل ''[سورہ اعراف/۱۷۹] (وہ لوگ دل رکھتے مگر سمجھتے نہیں، آنکھیں رکھتے مگر دیکھتے نہیں، کان رکھتے مگر سنتے نہیں، جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بڑھ کر گمراہ)ایسے میں خدا کا وہ نور جس نے روز 'الست' ربوبیّت کے سوال پر سب سے پہلے 'بلیٰ' کہا تھا، طلوع ہوا، اور گنتی کے چند لوگ اس کی کرنوں سے منوّر ہوئے۔ تو بھلا وہ لوگ کیسے گوارا کر لیتے کہ انھیں میں سے کچھ لوگ الگ ہو کر دیکھنے، سننے اور سمجھنے لگ جائیں؟ اس لئے اُن لوگوں نے اُس نور کو ایک معمولی سا جگنو سمجھ کر کچل دینے کی سعی میں پوری توانائی صرف کی، یہ نہ ہو سکا تو اس کی کرنوں ہی کو پھیلنے سے روکنے کی کوشش میں لگ گئے، مگر بھلا سورج کی کرنیں بھی کسی کے روکے سے رک سکتی ہیں؟

اب ایسا ہوا کہ ادھر کرنوں کا دائرہ بتدریج بڑھتا، اُدھر وہ ناسمجھ اندھے بہرے، جل بھُن کر مزید ستم پر ستم ڈھاتے۔ اس طرح اُن کی ستم رانیاں اپنی حد کو پہنچ گئیں تو اس نور کے نوری پروانوں کو مکہ چھوڑ کر حبشہ تک جانا پڑا، اس سے بھی ان کے غیظ وغضب میں کمی نہ آئی تو خود نور رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنے ہی مولد وموطن سے ہمیشہ کے لئے مدینہ ہجرت کرنا پڑا۔ وہاں بھی افرادی واسبابی قلت کی وجہ سے چین کی سانس لینا دوبھر کر دیا گیا اور ہجرت کے دوسرے سال ہی 'بدر' کی جنگ ہوگئی۔ جس میں نور خدا کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینے کی تمنا لے کر آئے ہوئے لشکر جرار کی تعداد ایک ہزار تھی، جن کے پاس ایک سو گھوڑے، سات سو اونٹ اور بے شمار آلات جنگ تھے۔ جبکہ جاں نثاران رسالت کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی اور جنگی سامان کے نام پر خدا اور رسول پر اعتماد و بھروسہ کے علاوہ صرف دو گھوڑے، ستر اونٹ، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔ پھر بھی ستر کفار قتل اور ستر جنگی قید ہو گئے تھے۔ اسی کو قرآن نے اپنے معجزانہ انداز میں یوں بیان فرمایا ہے:

ولقد نصركم الله ببدر وأنتم أذلة فاتقوا الله لعلكم تشكرون [آل عمران/۱۲۳] (اور بے شک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم بالکل بے سروسامان تھے۔ تو اللہ سے ڈرو تا کہ شکر گزار رہو) اس کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور جنگ 'خیبر' ہوئی، یہاں بھی خدا اور رسول کی نصرت سے فتح نصیب ہوئی۔ اس کے بعد بھی کفار اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آئے اور کئی جنگیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ چھٹے سال 'حدیبیہ' کے مقام پر صلح ہوگئی، جسے قرآن نے ''إنا فتحنا لك فتحا مبينا ''[سورہ فتح/۱] (بے شک ہم نے تمہارے لئے روشن فتح دی) سے یاد کیا اور واقعی یہی صلح مسلمانوں کی تعداد میں خاصے اضافے کا باعث بنی؛ کیوں کہ صلح کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو شخص مکہ سے مدینہ چلا جائے اسے واپس لینے کا حق ہوگا، لیکن جو مدینہ سے مکہ چلا جائے اسے واپس لینے کا حق نہیں ہوگا۔ اس لئے مکہ والے خفیہ طور سے مسلمان ہو کر وہیں رہ جاتے، مگر تھوڑے ہی دنوں بعد خود کفار ہی اس صلح سے دست بردار ہو گئے، جس کی وجہ سے وہاں رہنے والے مسلمانوں کو ایک حد تک کھلے طور پر اسلام کی دعوت دینے کا موقع فراہم ہو گیا۔ اس طرح مسلمانوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی گئی۔ نتیجتاً ۸/ھ کو مکہ فتح ہو کر اسلام کا غلبہ اور مسلمانوں کا بول بالا ہو گیا۔

یہ ہے قلت سے کثرت اور ذلت سے عزت کا شرف وامتیاز جو اللہ عزوجل اور اس کے رسول عزیز صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور خلوص ومحبت کے ساتھ رسول گرامی وقار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مضبوط وابستگی کا ثمرہ! کہ قرآن کریم نے ''اذا جاء نصر الله والفتح ورأيت الناس يدخلون في دين الله افواجا فسبح بحمد ربك

واستغفرہ انہ کان توابا'' (جب اللہ کی مدد اور فتح آئے اور لوگوں کو تم دیکھو کہ اللہ کے دین میں فوج فوج داخل ہوتے ہیں تو اپنے رب کی ثنا کرتے ہوئے اس کی پاکی بولو بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے) کا مژدہ دیتے ہوئے شکرانے کی تسبیح وتحمید پیش کرنے اور توبہ واستغفار کا حکم دیا، اور خدا اور رسول کی عزت بیان کرتے ہوئے ان مومنوں کی عزت پر گواہی ثبت کی اور فرمایا:

وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون۔ (سورہ منافقون ۸/)

ترجمہ: اور عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں ہی کے لئے ہے مگر منافقین کو خبر نہیں۔

اس لیے عاشق رسول امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے قرآنی اسلوب کی تقلید و پیروی میں ظاہری طور پر اس کی نسبت رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا:

کثرت بعد قلت پہ اکثر درود
عزت بعد ذلت پہ لاکھوں سلام

اور کس انداز میں فرمایا؟ اس کی ادبی حیثیت کو جاننے کے لئے تھوڑی دیر علم بیان و بدیع کے باغ کی اجمالی سیر دیکھیں۔

پہلے مصرع میں 'کثرت' اور 'قلت' کے درمیان ''تقابل تضاد'' ہے۔ اس سے مصرع میں قوت، وضاحت اور صوتی حسن پیدا کیا گیا ہے۔

اور دونوں ایک ہی مصرع میں ہیں اس لیے 'طباق' بھی ہے۔

پہلے مصرع کی طرح دوسرے مصرع میں بھی 'عزت' اور 'ذلت' کے درمیان 'تقابل تضاد' ہے۔ جس سے مصرع میں وہی قوت، وضاحت اور صوتی حسن ظاہر ہے۔

اور دونوں ایک ہی مصرع میں ہیں اس لیے 'طباق' بھی ہے۔

پہلے مصرع میں لفظ 'کثرت' اور 'اکثر' اسی طرح دوسرے مصرع میں لفظ 'عزت' اور 'لاکھوں' میں مراعاۃ النظیر بھی ہے۔

پہلے مصرع میں 'اکثر' اور دوسرے مصرع میں لاکھوں کے اندر مبالغہ بھی ہے۔

''کثرت'' سے 'قلت' کا اور 'عزت' سے 'ذلت' کا خاتمہ ہوگیا اس لیے فی الجملہ ارسال المثل والکلام الجامع بھی ہے۔

کثرت وعزت اور قلت وذلت کے درمیان فی الجملہ معنوی 'توافق' بھی ہے۔

'کثرت بعد قلت' اور 'عزت بعد ذلت' کہہ کر شعر میں سلاست وروانی کے ساتھ بطرز معکوس، پستی وتنزل سے 'عروج وترقی' کی جانب پیش قدمی کے لئے 'ایما' بھی کیا گیا ہے۔

ساتھ ہی اس شعر میں پوری دنیا کو یہ درس و پیغام دیا گیا ہے کہ قلت وذلت کبھی بھی اور کسی بھی نوعیت کی ہو، وہ دراصل تمہارے ہی کرتوتوں کا ثمرہ ہوتا ہے، اس لئے اس سے گھبرانے اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ ہر درد کا درماں اور ہر مرض کی دوا اسلام میں ہے۔ بس توبہ واستغفار کر کے اس کے دامن سے لپٹ جاؤ اور اخلاص ومحبت کے ساتھ اس سے وابستگی پیدا کرلو تو پھر اپنے غلبہ اور مقام ومرتبہ کا رنگ دیکھو:

لا تھنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين۔ [آل عمران ۱۳۹/]

ترجمہ: نہ سستی کرو، نہ غم کھاؤ تمھی غالب آؤ گے اگر ایمان رکھو۔

اس طرح یہ شعر وقتی نہیں بلکہ دوامی ہوگیا ہے۔ اسی طرح تنہا شاعرکانہ رہ کر آفاقی بھی ہوگیا ہے۔

اس شعر میں مذکورہ بالا ادبی محاسن کے علاوہ اور بھی کئی لفظی ومعنوی وجوہ تحسین ہیں جن کا بیان طول ممل سمجھ کر بالقصد ترک کر رہا ہوں اور امام ہی کا یہ مقطع:

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

لکھ کر قلم کو اذن رخصت دے رہا ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

فقیر محمد مطیع الرحمٰن رضوی غفرلہ

۲ محرم ۱۴۴۸ھ م ۱۸ جون ۲۶ء

□□□

عصرِ حاضر میں علمائے اہلِ سنّت کی سیاست میں نمائندگی

سوالات و جوابات کی روشنی میں ایک فکری مکالمہ

مولانا محمد ملک الظفر سہسرامی
مدیر اعلیٰ الکوثر، دار العلوم خیریہ نظامیہ سہسرام

عصرِ حاضر کا المیہ یہ نہیں کہ ہمارے پاس علما کم ہیں، بلکہ یہ ہے کہ فکر و قیادت کے درمیان فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ منبر کی صدائیں ایوان تک نہیں پہنچتیں اور ایوان کے فیصلے منبر کے شعور سے خالی ہیں۔ یہی وہ خلا ہے جس نے امتِ مسلمہ---خصوصاً اہلِ سنّت--- کو فکری انتشار، سیاسی کمزوری اور سماجی بے وزنی کا شکار بنا دیا۔

ہمارے اسلاف کے نزدیک سیاست عبادت کی اجتماعی صورت تھی۔ وہ منبر سے اتر کر میدان میں آئے اور میدان میں اتر کر بھی تقوے کے بلند مقام پہ قائم رہے۔ انہوں نے حکمرانی کو خدمت سمجھا، قیادت کو امانت جانا اور عدل کو ایمان کی عملی تعبیر بنایا۔ مگر افسوس! آج ہم نے دین کا یہ اجتماعی پہلو نظر انداز کر کے اسے صرف محراب و مصلے تک محدود کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہمارا دینی شعور تو بیدار رہا، مگر سیاسی وجود کمزور پڑ گیا۔ آج کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس سوال پہ سنجیدگی سے غور کریں، کیا سیاست سے اجتناب نے ہمارے مذہبی تشخص کو مجروح نہیں کیا؟ کیا سیاست کو محض اقتدار کی کشمکش سمجھنا ہمارے اسلاف کی فکر سے انحراف نہیں؟ اور کیا وقت نہیں آ گیا کہ ہم ایمان و عدل کی سیاست کو از سرِ نو زندہ کریں؟

انہی سوالات کی روشنی میں یہ فکری مکالمہ ترتیب دیا گیا ہے---جو نہ کسی جماعت کا منشور ہے، نہ کسی مصلحت کی تعبیر، بلکہ اہلِ سنّت کے فکری مستقبل، دینی تشخص اور اجتماعی بقا پہ ایک علمی و روحانی گفتگو ہے۔ یہ سوال و جواب دراصل ہماری فکری کمزوریوں کی تشخیص اور ایک عملی لائحۂ عمل کی تمہید ہیں، جس میں ماضی کی روشنی بھی ہے، حال کی تلخیاں بھی اور مستقبل کی سمت کا اشارہ بھی----تاکہ امت اپنے اسلاف کی وراثت کو پہچانے، اپنی فکری کمزوریوں کا ادراک کرے اور ایک ایسی سیاست کی طرف قدم بڑھائے جو اخلاق سے روشن، ایمان سے مربوط اور عدل سے مزین ہو۔

سوال 1: کیا ہمارے اسلاف نے سیاست کو غیر معنوی سمجھا؟

ہرگز نہیں!

ہمارے اسلاف کے نزدیک سیاست دین کا خارجی قالب تھی اور دین سیاست کی باطنی روح۔ انہوں نے سیاست کو اقتدار کی کشمکش نہیں، بلکہ نظامِ عدل و انصاف کے قیام کا ذریعہ سمجھا۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فقہی جلالت ہو یا امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب ''الخراج'' میں ریاستی نظم کی تشریح، امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تصنیفِ ''احیاء العلوم'' ہو یا شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' سب کے یہاں سیاست عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔

علامہ فضلِ حق خیر آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فکری صلابت سے لے کر امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ العزیز کی تجدیدی بصیرت تک، ہر بزرگ نے یہی پیغام دیا کہ ''سیاست اگر شریعت سے جدا ہو جائے تو فتنہ بن جاتی ہے۔''

ہمارے بزرگوں نے کبھی سیاست کو ترک نہیں کیا، بلکہ سیاستِ شرعیہ پہ اصرار کیا۔ آج اگر ہم اس روشنی سے محروم ہیں تو یہ ہمارے فکر کا زوال ہے، اسلاف کی فکر کا قصور نہیں۔

سوال 2: کیا سیاست سے اجتناب نے سنیت اور ہمارے

مذہبی تشخص کو نقصان پہنچایا؟

جی ہاں، یہ وہ تلخ حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

جب ہم نے منبر و محراب کے حدود کو ہی اپنی کائنات سمجھ لیا، تو اقتدار کے ایوان ان ہاتھوں میں چلے گئے جو نہ ہماری فکر سے آشنا تھے نہ ہمارے دین کے پاسبان۔

دینِ اسلام محض خانقاہ کی خموش فضاؤں کا نام نہیں، وہ عدل و حکمرانی، تعلیمی و معاشی نظام اور سماجی قیادت کا ایک جامع ضابطہ بھی ہے، سیاست سے کنارہ کشی کی اسی ذہنیت نے ہمیں حاشیہ بردار امت بنا دیا----

مدارس پہ دباؤ بڑھے، جماعتی ادارے کمزور ہوئے اور ملت کا وقار مجروح ہوا ملت کی اجتماعی آواز محض رسوم و رواج تک محدود ہو کر رہ گئی۔

آج ہم ایک ایسے موڑ پہ کھڑے ہیں جہاں ہماری آواز سنی تو جاتی ہے مگر مانی نہیں جاتی۔

یہ خاموشی ہماری اپنی کمزوریوں کا شور ہے۔

لیکن...... یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے، جہاں پوری ملت کا سیاست سے اجتناب نقصان دہ ثابت ہوا، وہیں کچھ افراد کی فعال سیاست میں شمولیت بھی ابتلا و آزمائش کا سامان بنی، کچھ چمکتی پیشانیوں والے اربابِ فضل و کمال جب قوم کے دکھ درد کا علم اُٹھا کر میدان میں اترے تو اقتدار کی چکا چوند انہیں اس قدر خیرہ کر گئی کہ ملت کے مفاد کی سوداگری ان کے لیے کوئی اجنبی عمل نہ رہا۔

لبوں پہ مذہب......اور ہاتھوں میں مفاد! عوام کے جذبات سے کھیل کر خود کو نجات دہندہ کہلوانا، لیکن فیصلہ کن گھڑی میں قوم کو تنہا چھوڑ دینا----یہی وہ تضاد ہے جس نے اعتماد کے ستونوں کو ہلا کر دیا۔

ایسے کرداروں نے ہمیں یہ سبق دیا کہ سیاست میں صرف جبہ و دستار کافی نہیں ہوتا

کردار کی مضبوطی، نیت کی پاکیزگی اور اصولوں کی پاسداری بھی ضروری ہے، ورنہ مذہبی شناخت پہ اقتدار کی ٹھیس پڑتی ہے اور ملت کی امیدیں خاک ہوتی ہیں- پس! آج کا تقاضا یہ ہے کہ نہ مکمل اجتناب......اور نہ غیر ذمہ دار شمولیت۔ بلکہ علم و تقوے کے ساتھ قیادت و بصیرت کا امتاج----وہ قیادت نہیں جو قوم پہ حکومت کرے، بلکہ وہ جو قوم کے دلوں میں بستی ہو، جو ملت کے لیے جینے کا مزاج بنائے، ملت پہ اپنی حیات کا مدار نہ رکھے۔ ایسی قیادت ہی ایمان و کردار کی امین اور سیاستِ شریعت کی حقیقی صورت ہے۔

سوال 3: اس فرق و انتشار کے خاتمے کی تدبیر کیا ہے؟

فرق و انتشار کا علاج کسی قرارداد یا جلسے سے نہیں، اجتماعی شعور کی بیداری سے ممکن ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ اختلافِ رائے فطری ہے، مگر افتراقِ دل مہلک۔ ایک ہی مسلک کے اندرونی اختلافات کو کم کرنا زیادہ ضروری ہے۔ قیادت کو خانقاہی حدود سے اوپر اٹھ کر ملت کے اجتماعی مفاد پہ نگاہ رکھنی ہوگی۔ جب تک ہم ذاتی انا، موروثی تسلسل اور حلقہ جاتی نفع و نقصان کے اسیر رہیں گے، اتحاد خواب ہی بنا رہے گا۔ ملت کو ایک ایسے فکری نظم کی ضرورت ہے جو اجتماعِ دل، احترامِ علم، اور نظمِ عمل پہ استوار ہو۔

سوال 4: کیا آپ اپنی جماعت کے لیے ایک سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

یقیناً! آج کا دور تقاضا کر رہا ہے کہ اہلِ سنّت اپنی علمی و دینی روایت کے ساتھ ایک منظم سیاسی شناخت بھی قائم کریں۔ سیاست سے فرار، سماجی انحطاط کو دعوت دینا ہے۔ یہ وہ میدان ہے جہاں سے ملت کے تعلیمی ادارے، اس کی دینی آزادی اور معاشی وقار متاثر ہوتے ہیں۔ ہمیں ایک ایسا پلیٹ فارم درکار ہے جو شخصیت پرستی سے پاک، اصولی بنیادوں پہ قائم ہو اور قیادت کے احتساب سے آراستہ ہو۔ یہ پلیٹ فارم صرف ووٹ کے لیے نہیں بلکہ فکر و قیادت کی تربیت کے لیے ہونا چاہیے، تاکہ نئی نسل منبر کے ساتھ ایوان میں بھی ایمان کی خوشبو پھیلائے۔

سوال ۵: اگر ضرورت ہے تو اس کے قیام کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

اس کا قیام دو بنیادوں پہ ممکن ہے:

اوّل: فکری و تعلیمی اصلاح۔ سب سے پہلے ایک ہمہ گیر بیداری مہم چلائی جائے جس کے ذریعے عوام و خواص دونوں کو یہ حقیقت سمجھائی جائے کہ سیاست دین سے الگ نہیں بلکہ دین کی اجتماعی اور عملی تعبیر ہے۔ منبر و محراب کو محض عبادت کا مرکز نہیں بلکہ تربیت و شعور کی آماجگاہ بنایا جائے۔ درسگاہوں میں سیاسی اخلاقیات، ملی شعور اور سماجی ذمہ داری کا سبق شامل کیا جائے تاکہ نئی نسل صرف مصلّیٰ امامت کی ذمہداری نہ نبھائے بلکہ ایک پاک طینت مصلح معاشرہ بھی بنے۔

دوم: ادارہ جاتی نظم

خانقاہوں، مدارس، تنظیموں اور اہلِ علم و دانش پہ مشتمل ایک مرکزی شوریٰ کونسل تشکیل دی جائے جو تدریجاً ایک مضبوط اور منظم

سیاسی قوت کی شکل اختیار کرے۔ یہ سفر فوری نہیں بلکہ بتدریج ہوگا، لیکن اگر نیت خالص ہو، نظام شفاف ہو اور قیادت اصول و انصاف پہ قائم ہو، تو منزل دور نہیں۔ البتہ ایک نکتہ نہایت اہم ہے۔ اگر ہم مذہب کے نام پہ براہِ راست سیاسی جماعت تشکیل دیں گے تو موجودہ قومی منافرت کی غلیظ فضا میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور منافرت میں اضافہ ہوسکتا ہے، جس کا براہِ راست فائدہ انہی قوتوں کو پہنچے گا جو سماج میں نفرت، تنگ نظری اور تفریق کی سیاست کر رہی ہیں۔ اس لیے حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سیکولر، انصاف پسند اور محروم طبقات --- بالخصوص دلت، پسماندہ اور اقلیت نواز حلقوں --- کے ساتھ اصولی اشتراکِ عمل پیدا کریں۔ یہ اشتراک کسی وقتی اتحاد یا انتخابی مصلحت کے لیے نہیں بلکہ جمہوری توازن اور اخلاقی سیاست کے فروغ کے لیے ہونا چاہیے۔ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی ہم نے عدل، مساوات اور انسانیت کے اصولوں کو بنیاد بنایا، قوموں کے دل خود بخود ہمارے ہم نوا بن گئے۔ لہٰذا، ہماری سیاسی تعمیر کا راستہ مذہبی جھنڈوں سے نہیں، اخلاقی و انسانی قدروں کی پرچم برداری سے کھلتا ہے۔ ہمیں مذہب کے نام پہ جماعت بنانے سے زیادہ مذہب کے اخلاق پہ جماعتیں بنانے کی ضرورت ہے --- تاکہ دین کی روح بھی سلامت رہے اور ملت کی سیاست بھی باوقار انداز میں نمایاں ہوکر سامنے آئے۔

''سیاست اگر اخلاق سے جدا ہوجائے تو فساد پیدا کرتی ہے، اور اگر ایمان سے مربوط ہوجائے تو عدل کو جنم دیتی ہے۔ آج ہمیں اسی ایمان وعدل کی سیاست درکار ہے۔''

ہمارے اسلاف نے سیاست کو نہ مفاد کا میدان سمجھا نہ اقتدار کا جواز، بلکہ امانتِ الٰہی کے نفاذ کا ذریعہ مانا۔ آج ہمیں اسی امانت کو از سرِ نو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی سیاست کے ذریعے جو مذہب کے جھنڈے سے نہیں بلکہ اخلاق، علم اور عدل کی بنیاد پہ متحد دلوں سے ابھرے۔ جب منبر و ایوان کا رشتہ دوبارہ قائم ہوگا، جب خانقاہوں کی خاموش دعائیں میدانِ عمل میں ڈھلیں گی اور جب قیادت ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر ملی ضرورت دیکھے گی۔ تب یقیناً یہ امت اپنے فکری وقار اور سیاسی احترام کو واپس حاصل کرے گی۔ اب وقت ہے کہ ہم سیاست کو دین سے جدا نہیں، دین کی خدمت کا وسیلہ سمجھیں۔ کیوں کہ یہی ایمان وعدل کی سیاست ہماری شناخت، ہماری بقا، اور آنے والی نسلوں کا روشن مستقبل ہے۔

سیاست شرعیہ، ملت کی بقا کی ایک مضبوط ضمانت ہے، ہمارے اسلاف نے کبھی سیاست سے یوں علیحدگی اختیار نہیں کی، بلکہ اسے شریعت کی تلوار اور اخلاق کی ڈھال بنایا۔ ہم نے جب یہ تلوار نیام میں ڈال دی تو ظلم نے راج کیا اور جب ہم نے اخلاق کی ڈھال اتار دی تو قوم زخموں سے بھر گئی۔ اب وقت ہے کہ ہم اپنے فکری ورثے کو بیدار کریں، اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں اور ایک ایسا منظم سیاسی نظام قائم کریں جو دین کو سماج اور ایمان کو ریاست کی سطح پہ نافذ کر سکے۔ یہی ہمارے اسلاف کی وصیت ہے --- یہی ایمان وعدل کی سیاست کا تسلسل اور یہی ہماری بقا کی آخری ضمانت۔

منبر کی روشنی سے ایوان تک کا سفر:

وقت کی کروٹیں بدلتی رہتی ہیں، مگر قوموں کی بقا اُن اصولوں سے وابستہ رہتی ہے جو عدل، علم اور ایمان پہ قائم ہوں۔ آج جب امت کے افق پہ فکری غبار چھا چکا ہے اور قیادت کے چراغ مدھم پڑنے لگے ہیں، ایسے میں ضروری ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے آئینے میں جھانکیں اور اُن روشن نقوش کو پہچانیں جن پہ ہمارے اسلاف نے قوموں کی تقدیر لکھی تھی۔ انہوں نے بتا دیا کہ دین اگر دلوں کو سنوارتا ہے تو سیاست معاشروں کو ترتیب و تحسین کا کام انجام دیتی ہے، دونوں کو جدا کر دینا ایسا ہی ہے جیسے روح کو بدن سے الگ کر دیا جائے۔ اب ضرورت ہے کہ منبر کی روشنی ایوانوں تک پہنچے اور ایوانوں کی زبان منبر کی صداقت آفرینی سے آشنا ہو۔

جب علم کردار سے ہم رشتہ ہوجائے اور قیادت عبادت بن جائے، تب ہی ملت اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ ہمیں ایسی سیاست چاہیے جو قرآن کے عدل، مصطفوی اخلاق اور اولیائی بصیرت سے روشن ہو۔ ایسی قیادت چاہیے جو عوام پہ حکومت نہیں، ان کے دلوں میں ایمان پیدا کرے۔ یہی وہ سیاستِ شرعیہ ہے جو قوموں کو بیدار کرتی ہے، یہی وہ بصیرت ہے جو امت کے شیرازے کو جوڑتی ہے اور یہی وہ امانت ہے جس کے بغیر نہ دین مکمل ہوتا ہے نہ ملت محفوظ رہتی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے فکر و عمل کے اس بکھرے ہوئے کارواں کو جمع کریں، پھر ایمان کو سیاست کی ضمیر بنائیں، عدل کو قیادت کا معیار اور اخلاق کو جماعت کا عنوان۔ جب یہ تین ستون قائم ہو جائیں گے، تو یقیناً منبر اور ایوان دونوں پھر سے ایک مرکز پہ جھکیں گے اور جماعت اہلِ سنّت ایک بار پھر علم و قیادت کے مینار کی طرح دنیا کے سامنے سر اٹھا کر کھڑی ہوگی۔

□□□

عہد وسطیٰ میں مسلم حکمرانوں کی رواداری

ابرار احمد دہلی

"۔۔۔۔شر پسند عناصر نے یہ مفروضہ طشت از بام کر رکھا ہے کہ محمود غزنوی ایک تنگ دل اور متعصب مسلم حکمراں تھا، وہ ہندوؤں سے دشمنی رکھتا تھا، اس نے غیر مسلموں سے ان کی مذہبی اور سماجی آزادی سلب کر لی تھی، جب کہ تاریخی حقائق کچھ اور کہتے ہیں۔ میدان جنگ کی بات دوسری ہے، یہاں تو ایک بھائی دوسرے بھائی کی گردن مارنے کے درپے ہوتا ہے۔ ورنہ محمود غزنوی تو اہنسا اور عدم تشدد کا داعی تھا۔ ان کی رحم دلی اور نرم خوئی کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ راجپال، انند پال اور دیگر ہندو راجاؤں کی مسلسل ناقابل برداشت بدعہدیوں کے۔۔۔۔"

جنت نشاں غیر منقسم ہندوستان کے طول وعرض پر کم وبیش آٹھ سو سال تک کئی مسلم خاندانوں نے حکومت کی ہے اور ہر خاندان سے تعلق رکھنے والے بادشاہ نے ہندستان کے تاج زرنگار اور اس کے تخت طاؤس میں نت نئے گل بوٹوں کا اضافہ کیا ہے۔ چمنستان ہند کی آبیاری اور اس کی ہمہ جہت ترقی اور خوش حالی ان کی حیات مستعار کا شیوہ تھا۔ رواداری، وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرنا اور پرامن بقائے باہم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا کو برقرار رکھنا ان کی حاکمانہ زندگی کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے حریم حکومت میں ہندو مسلم یا سکھ عیسائی کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ انھوں نے کثرت میں وحدت سے عبارت یہاں کی گنگا جمنی تہذیب اور بھائی چارہ کے تصور کو فروغ دینے میں کسی طبقاتی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ عہد وسطی میں مسلم حکمرانوں نے امن وسلامتی اور صلح وآشتی کے آدرشوں کو روبہ عمل لاتے ہوئے، جس شاندار طریقہ سے حکومت کی ہے، وہ ہندوستانی تاریخ کا ہی نہیں، عالمی تاریخ کا بھی ایک روشن اور باعث صد افتخار باب ہے، سرزمین ہند سے ان مسلم بادشاہوں کی اٹوٹ محبت کا اندازہ کرنے کے لیے بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ یہاں مختلف سماجی، تجارتی اور سیاسی وجوہ کی بناء پر آئے، لیکن ایک بار قدم رکھنے کے بعد اپنے آباواجداد کے مسکن ومدفن اور جان سے زیادہ عزیز اپنی جائے پیدائش کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا، بلکہ یہاں کی خاک سے اس قدر محبت، دلچسپی اور وابستگی بڑھ گئی کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے، ان کے اخلاف اور اولاد واحفاد نے بھی اسی مٹی پر جنم لیا اور یہیں کی خاک کو اپنی آخری آرام گاہ بھی بنایا۔ یہ مسلم حکمراں عرب وترکی اور افغانستان وایران سے آئے تھے، لیکن کسی نے بھی یہاں عربستان

یا ترکمانستان وافغانستان بنانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ وطن عزیز ہندستان کی وحدت اور سالمیت کو ایک جاں باز اور وفادار سپاہی کی طرح تحفظ فراہم کیا۔ اور یہ ملک ہندوستان ہی رہا۔ انھوں نے اس خطۂ زمین سے اپنے مادر وطن کی طرح پیار کیا۔ انہوں نے جہاں اسلامی تہذیب وثقافت کی جو صحیح معنوں میں انسانیت وشرافت اور اعلی انسانی اقدار سے عبارت تھی، ترویج وترقی اور توسیع وتبلیغ کے عمل کو مذہبی فریضہ کے تحت انجام دیا وہیں رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خوشگوار برادرانہ تعلقات کا عملی مظاہرہ بھی پیش کیا، انھوں نے آج کے حکمرانوں کی طرح ذات پات، نسلی تفریق اونچ نیچ اور مذہبی خطوط پر نظام حکومت وضع نہیں کیا، بلکہ ان کی حکومت عدل وانصاف، مودت ومحبت، بھائی چارگی اور مساوات کی اعلیٰ اور پائیدار بنیادوں پر ہی قائم ہوتی تھی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رواداری، بقائے باہم کا عالمی تصور اور خاص طور سے یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ اور برادرانہ برتاؤ ان مسلم حکمرانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ غیر مسلموں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی نگہداشت کے حوالے سے وہ بہت محتاط رہتے تھے۔ فرض شناسی اور عدل گستری ان کی زندگی کا شناخت نامہ تھی۔ ان کے اندر وسعت ظرفی اور فراخدلی اس حد تک تھی کہ وہ ان کے مذہبی رسم ورواج اور ان کی خصوصی مذہبی تقاریب میں بھی بصد خوشی شرکت کرنے کے حامی تھے، جن کے طریقۂ کار اسلام مخالف تھے۔ ہندوؤں کے تہذیبی اور معاشرتی وجود سے انہیں کسی بھی درجے میں تنفر نہیں تھا۔ وہ مختلف اقوام وملل کا پاس ولحاظ اور ان کے حقوق ومطالبات کا پورا احترام کرتے تھے۔ ان کے عہد حکومت میں شہریوں کے مابین قومی یک جہتی کا تصور بدرجۂ اتم موجود تھا۔ سماجی مساوات اور قانونی ومعاشی انصاف نظامہائے حکومت کی اساس تھا۔

ان تمام تاریخی حقائق کے باوجود المیہ یہ ہے کہ معاصر ہندوستان کے اکثر تاریخ نویس سیاست سے مرعوب اور گردوپیش کے حالات سے متأثر نظر آتے ہیں، انہوں نے چند ذاتی اغراض ومقاصد کے پیش نظر اور چند ٹکوں کے حصول کے لیے تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت کو تسکین دی ہے۔ ان کی غلط تاریخ نگاری کی وجہ سے ہندوستان کی سچی اور مبنی برحقائق تاریخ جھوٹ اور افتراء پردازیوں کا آمیزہ بن کر رہ گئی ہے۔ زیادہ تر یوروپین مؤرخین اور سفید فام انگریزوں نے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ہمارے اسلاف اور مسلم حکمرانوں کے عدیم المثل کارناموں کو آگ اگلتی تحریروں اور شرارت بھری تقریروں سے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اس سے معصوم اذہان بھی پراگندہ ہو گئے۔ ان کی طرف سے شائع ہونے والے لٹریچر اور تاریخی کتابوں سے جو اثرات مرتب ہوئے اس سے فرقہ واریت کی مزید آبیاری ہوئی۔ انھوں نے فرقہ واریت اور ہندو مسلم منافرت کی جو تخم ریزی کی تھی، اسی کی فصل آج کے فاشسٹ اذہان کے لوگ کاٹ رہے ہیں اور فرقہ پرستی کا زہر ہندستان کے جسم نازک میں گھول رہے ہیں۔

برطانوی سامراج نفرت وحقارت اور فرقہ پرستی کا جو بیج بو کر ہندوستان سے گیا تھا وہ آج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ریاستوں کے سرکاری اسکولوں میں ایسی کتابیں داخل نصاب کردی گئیں اور ہنوز کی جارہی ہیں جن سے مسلم دور حکومت اور مسلم حکمرانوں کی غلط تصویر کشی ہوتی ہے۔ مسلم حکمرانوں پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ بت شکن تھے۔ ہندو مخالف تھے۔ مندروں کی مسماری اور غیر مسلموں کے عبادت خانوں کا انہدام حکومت کی منظم اور منصوبہ بند سازش تھی۔ وہ جبراً ہندوؤں کو مسلمان بناتے تھے۔ غیر مسلموں کو حکومتی مراعات سے محروم رکھتے تھے۔

جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، تاریخی حقائق بتلاتے ہیں کہ مسلم حکمراں بہت ہی روادار، رحم دل اور فراخ دل ہوتے تھے، کسی بھی مسلم بادشاہ کی اسٹیٹ پالیسی یہ نہیں تھی کہ غیر

مسلموں کو جبراً مسلمان بنایا جائے اور انھیں تبدیلی مذہب پر مجبور کیا جائے، مندروں اور بتوں کو توڑا جائے، اس طرح کی ہندو مخالف پالیسی ان سے منسوب کرنا سراسر تاریخی بددیانتی ہے۔

مشہور مؤرخ خلیق احمد نظامی بجا طور پر لکھتے ہیں: ''ہندوؤں کو نہ صرف پوری مذہبی آزادی حاصل تھی بلکہ ان کے رسوم وعقائد، فلسفہ وافکار کو نہایت ہی ہمدردانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی، بت پرستی پر طعنہ کے بجائے مسلمان ان کے جذبوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے''۔

(سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات: ۷۴)

ذیل کی سطروں میں چند مسلم حکم رانوں کا تذکرہ تاریخی حقائق کی روشنی میں کیا جارہا ہے۔ تاکہ مبالغہ اور بےجا الزامات سے مبرا اور منزہ ان کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے آسکے اور فرقہ پرست طاقتوں اور ملک کے فاشسٹ عناصر کو ان کا منھ تاریخ کے سچے آئینے میں دکھا سکے۔

جواں سال محمد بن قاسم پہلا مسلم شخص ہے جس نے سب سے پہلے سرزمین ہند پر قدم رکھا تھا۔ انھوں نے راجہ داہر کو اس کی بدعہدی اور وعدہ خلافی کی وجہ سے جنگ کے میدان میں شکست دی تھی اور جب ہزیمت کا کشکول اس کے ہاتھوں میں تھما کر، سندھ میں تخت نشین ہوا تو یہاں ہندوؤں کے ساتھ روادارانہ اور دوستانہ تعلقات کا ایک خوشگوار اور قابل رشک تصور پیش کیا، جمہوریت اور سیکولرازم ان کے طرز حکومت کا شناخت نامہ تھا، ان کے عہد حکومت میں ہندوؤں اور بودھوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی، کسی سے مذہب اور سماج کی بنیاد پر تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ انھوں نے حکومت میں سب کو حصول معاش کا مساوی موقع فراہم کیا اور ان کو بڑے قابل قدر عہدے تفویض کئے گئے۔ ایک غیر مسلم ان کے دور حکومت میں وزارت اعلیٰ کے قابل قدر عہدے پر فائز تھا۔ لیکن پھر بھی محمد بن قاسم زعفرانیت کا شکار برادران وطن کی نظروں میں ظالم اور ہندو دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ مسٹر چونی لال نے اپنے تحقیقی مضمون میں حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے لکھا ہے: ''محمد بن قاسم ہندوؤں کی سوشل اور مذہبی رسومات واعتقادات کی عزت کرتا تھا، ہندوؤں کی سوشل اور مذہبی انسٹی ٹیوشنوں میں کوئی مداخلت نہیں کرتا تھا''۔ (اسلام اور غیر مسلم: ۱۷۵)

شرپسند عناصر نے یہ مفروضہ طشت ازبام کررکھا ہے کہ محمود غزنوی ایک تنگ دل اور متعصب مسلم حکمراں تھا، وہ ہندوؤں سے دشمنی رکھتا تھا، اس نے غیر مسلموں سے ان کی مذہبی اور سماجی آزادی سلب کرلی تھی، جب کہ تاریخی حقائق کچھ اور کہتے ہیں۔ میدان جنگ کی بات دوسری ہے، یہاں تو ایک بھائی دوسرے بھائی کی گردن مارنے کے درپے ہوتا ہے۔ ورنہ محمود غزنوی تو اہنسا اور عدم تشدد کا داعی تھا۔ ان کی رحم دلی اور نرم خوئی کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ راجپال، انند پال اور دیگر ہندو راجاؤں کی مسلسل ناقابل برداشت بدعہدیوں کے باوجود جب وہ ان کے مدمقابل ہوتے تھے، وہ ان سے چشم پوشی اور درگزر کرتے تھے۔ ہزاروں غیر مسلم فوجی ان کے دفاعی نظام میں سپہ سالار اور سپاہی کی حیثیت سے موجود تھے۔ تلک سندر اور بیج ناتھ کو انھوں نے جنرل کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ محمود غزنوی ہی وہ مسلم حکمراں ہے جس نے سومنات کا مفتوحہ علاقہ راجہ سکھ پال کو عطیہ میں دے دیا تھا، یہ وہی راجا سکھ پال ہے جس نے کئی بار عہد وپیمان شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔ محمود غزنوی کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ اس نے غیر مسلموں کی دل جوئی کے لیے اپنی حکومت کے سکہ کے ایک جانب عربی میں تو دوسری جانب ہندوؤں کی متبرک مذہبی زبان سنسکرت میں عبارت نقش کرائی تھی۔ ان تمام واشگاف حقائق کے باوجود محمود غزنوی ظالم وجابر اور متعصب وتنگ نظر ہے۔ زعفرانیت زدہ لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے مسٹر الفنسٹن کا مندرجہ ذیل اعتراف کافی ہے، وہ کہتا ہے: ''ہم ایک مثال بھی ایسی نہیں سنتے کہ اس نے (محمود غزنوی نے) کسی ہندو کو جبراً مسلمان

بنایا ہو، ایک شہادت بھی ایسی نہیں کہ جنگ یا قلعہ گیری کے موقع کے سوا اس نے کسی ہندو کو قتل کروایا ہو''۔ (تاریخ ہند:۶ ۳۳)

محمد غوری اسلامی مزاج و منہاج پر نظام حکومت چلانے والا ایک نہایت مخلص اور نرم دل بادشاہ گزرا ہے، رواداری اور ایثار و ہمدردی کے جذبات کا عالم دیکھئے کہ اس نے اپنے سب سے بڑے دشمن ''پرتھوی راج'' کے دونوں بیٹوں کی دل کھول کر شاہانہ انداز میں نگرانی و سرپرستی کی، ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں: ''محمود اور محمد غوری مذہبی تعصب سے بالکل پاک تھے، اگرچہ انہوں نے ملاحدین کو سزائیں دیں؛ لیکن کسی کو تبدیلی مذہب پر مجبور نہیں کیا''۔ (اسلام اور غیر مسلم:۱۸۸)

تغلق خاندان سے تعلق رکھنے والا مسلم بادشاہ، محمد شاہ تغلق علم دوست اور عدل و انصاف میں ضرب المثل تھا، اپنے مذہب کی پیروی میں سخت تھا، شریعت محمد یہ میں مداخلت اور مذہب اسلام کے معاملے میں کسی بھی مفاہمت کا روادار نہ تھا، مگر دیگر مذاہب و ادیان کے حوالے سے متعصب بھی نہیں تھا، بقول ایشوری پرساد'' اس کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ بہت اچھے تھے''۔

ملک کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سیاسی مفادات کی روٹی سینکنے کے لیے، چند متعصب اور خام ذہن کے حامل ہندوؤں نے ان کی طرف نامناسب اور غیر حقیقی واقعات کا انتساب کیا ہے۔ ہندوؤں سے مذہبی آزادی سلب کرنے، مندروں کا انہدام، مذہبی میلوں میں آمد و رفت پر عام رعایا کی پابندی اور پوجا پاٹ میں اڑچنیں ڈالنے کے نام نہاد واقعات یہ سب کچھ ان کے پس منظر اور پیش منظر میں غور نہ کرنے کا فطری نتیجہ ہیں، چوں کہ بعض مندر اور مذہبی میلے اخلاقی بگاڑ، فتنوں اور فحاشی و عریانیت کا اڈہ اور ذریعہ بن گئے تھے؛ اس لیے اخلاقی تقاضوں کے پیش نظر اُن پر پابندی مملکت کے نظم و نسق کے تئیں بالکل موزوں اور مناسب تھا؛ چنانچہ ایک اسکالر ''ایشور ٹوپا'' لکھتا ہے: ''فیروز شاہ نے اسلامی قانون کے تحت اور دوسری طرف پبلک کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا''۔

(ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول:۸۹)

سلاطین مغلیہ کے جد امجد ظہیر الدین بابر کو دوسرے مسلم حکمرانوں کے بالمقابل کچھ زیادہ ہی ملعون و مطعون ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے اور تاریخ کے آئینے میں ان کے روشن چہرے کو اتنا دھندلا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی سفاکانہ اور قاتلانہ ذہنیت کی تعبیر کے لیے موجودہ عہد میں ہندی مسلمانوں کو بابر کی اولاد کا طعنہ دینے کا رجحان عام کیا جارہا ہے۔ حالاں کہ ظہیر الدین بابر روادار تھا، فراخ دل تھا، غیر مسلموں کا خیر خواہ تھا، عدل گستر اور رعایا پرور تھا، اگر اس کی سرشت میں یہ عناصر داخل نہ ہوتے، تو وہ کیوں اپنے بیٹے ہمایوں کو ہندوؤں کے ساتھ ہمدردی اور خیر سگالی کی تلقین کرتا۔ بابر نے بستر مرگ پر ہمایوں کو جن ہمدردانہ کلمات کے ساتھ وصیت کر کے اپنی رعایا سے حد درجہ قلبی لگاؤ کا اظہار کیا تھا، وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اور فرقہ پرست عناصر کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے، ہندوؤں کے جذبات واحساسات کا خیال رکھنے کے متعلق انہوں نے ہمایوں سے کہا تھا: ''مذہبی تعصّبات سے اپنے دماغ کو متأثر نہ ہونے دینا، ہر قوم و مذہب کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے ایک غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنا، تم کبھی بھی کسی قوم کے عبادت خانہ کو منہدم نہ کرنا''۔

جس بابر کو آج ایودھیا میں رام مندر کے انہدام کا قصوروار ٹھہرایا جارہا ہے اور اس کی جگہ تعمیر شدہ مسجد کو مسمار کر کے پورے ملک میں فرقہ واریت کا ننگا ناچ ہوا اور ہنوز یہ سلسلہ مختلف حیلوں حوالوں سے جاری ہے، اسی بابر نے ایک اچھوت مہترانی کے بچے کو بدمست ہاتھی کی زد سے بچا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا، جس کی چیخ و پکار اور آہ و بکاء کو جائے واردات کے قریب ہی موجود ایک اعلی ذات کے راجپوت نے سننے اور اس کی مدد کو پہنچنے سے صرف اس لیے انکار کر دیا تھا کہ وہ ایک نیچی ذات کے بچے کو ہاتھ لگا کر اپنی شان و شوکت اور اپنی نام نہاد مذہبیت کو بھرشٹ کرنا نہیں

چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بابر ایک سچا رحم دل اور رعایا کا بہی خواہ اور انسان دوست حکمراں تھا۔ مجھ جیسے نوعمر اور ناتجربہ کار کو تو اس بات پر کبھی یقین نہ آیا کہ ایسا نیک دل انسان کیسے کسی مذہب کی عبادت گاہ کو مسمار کرسکتا ہے۔ اگرچہ تاریخی حقائق نے ان تمام الزامات کے غبارے کی ہوا نکال کر رکھ دی ہے، مگر جن لوگوں نے بھی بابر پر مندر شکنی کا یہ الزام رکھا ہوگا، کیا اس نے کبھی تنہائی میں بابر کی غیر متعصب زندگی کے خد و خال کا مطالعہ نہیں کیا۔۔۔؟

شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے پوتے اور عظیم مسلم بادشاہ جہانگیر پر بھی لعن طعن کرنے اور اس کو متعصب ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالاں کہ جہاں گیر ظلم و استحصال اور جبر و تشدد سے سخت نفرت کرتا تھا، غیر مسلم رعایا کے جائز مطالبات کے پورا کرنے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کو اپنا اولین فریضہ تصور کرتا تھا، ان کے عہد حکومت میں بڑے بڑے مندر تعمیر ہوئے، متھرا میں واقع ''گوبند دیوی'' کا مندر بھی انہی کی کرم فرمائی اور نوازشوں کا رہین منت ہے، جہاں گیر میں مذہبی اور سماجی تعصب نام کو بھی نہ تھا، وہ تو اتنا وسیع النظر تھا کہ غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں میں بھی خندہ دلی اور پوری شاہانہ آن بان اور لاؤ لشکر کے ساتھ شرکت کرتا تھا۔

جہاں گیر کے لخت جگر شاہ جہاں کی رواداری اور رعایا پروری سے کون واقف نہیں۔ اس کے عہد حکومت میں مختلف علاقوں سے لوگ آئے، جن کی زبان بھی مختلف تھی اور طرز بود و باش بھی۔ مختلف تہوار منانے والے، مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف تہذیب و تمدن کو اپنانے والے ہندوؤں کی اس وقت ہندستان میں کثرت تھی؛ مگر دین الٰہی کے موجد اکبر کے پوتے شاہ جہاں نے ایک روادار اور جمہوریت پسند حکمراں کی نفسیات کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے غیر مسلم رعایا کے مذہبی جذبات و احساسات اور افکار و نظریات کا پورا پاس و لحاظ رکھا، انہیں مکمل مذہبی آزادی دی؛ ہندستان کے نامور مصنف حفیظ اللہ نے بجا طور پر کہا ہے کہ: ''شاہ جہاں اپنی رعایا کے ساتھ کسی مذہبی امتیاز کے بغیر یکساں سلوک کرتا تھا اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کو مامور کرتا تھا''۔

(اسلام اور غیر مسلم: ۲۰۱)

مسلسل پچاس سالوں تک ہندوستان پر حکومت کرنے والے قابل فخر مسلم بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر پر تو خاص طور سے فرقہ پرستوں کی نظر عنایت مرکوز رہی ہے۔ شروع سے ہی ہمارے نام نہاد تاریخ نگاروں نے ان کے طرز حکومت کا مشروط ذہن کے ساتھ محاسبہ اور محاکمہ کیا ہے۔ اور اس طرح ان کے اوپر بھی نفرت و تعصب کا لبادہ ڈال دیا گیا ہے، عموماً یہ بات مشہور کردی گئی ہے کہ اس نے لاکھوں ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا، لاکھوں غیر مسلموں کو تہ تیغ کیا، کئی مندروں کو توڑا، انہیں سیاسی، معاشی اور اقتصادی سطح پر لاچار و کمزور کیا، لیکن سچی اور حقیقی تصویر کچھ اور ہے۔ تاریخی اوراق اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ وہ بڑے ہی انصاف پسند اور رعایا پرور تھے۔ ان کی عالم گیر اور قابل رشک رواداری سے متأثر ہوکر ایک ہندو مؤرخ لکھتا ہے: ''کاشی پریاگ اور دوسری عبادت گاہوں کے لیے اس نے جو جاگیریں وقف کی ہیں اور ہندو پیشواؤں کے ساتھ جو رعاتیں کی ہیں، ان سے اس کی انصاف پسندی ثابت ہوتی ہے۔ (تاریخ ہند: ۶۵۸)

اورنگ زیب اپنے مذہب اور اسلامی مسلمات سے انحراف اور روگردانی کو برداشت نہیں کرتے تھے، مگر یہ حقیقت بھی بجا ہے کہ انہوں نے اسلام کی اشاعت کے لیے کوئی سرکاری یا نیم سرکاری تنظیم نہیں قائم کررکھی تھی، جس سے اسلام کی توسیع و تبلیغ کا کام لیا جاتا رہا ہو، چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے: ''اس نے کبھی کسی غیر مسلم کو بالجبر مسلمان نہیں بنایا؛ بلکہ اس نے غیر مسلموں کی دلداری کی انتہائی کوشش ہے''۔

(پریچنگ آف اسلام: ۱۰)

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں مندریں پوری طرح تحفظ کے زیر سایہ تھیں، ان میں دستبرد سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اور اگر ہندوؤں کی کسی عبادت گاہ کو مسمار کیا گیا ہے تو وہ پالیٹکل مصالح کی بنیاد پر تھا؛ وہ عبادت گاہ نہیں رہ گئی تھی، بلکہ بوالہوسوں کی عیاشی اور لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا اڈہ بن گئی تھی۔ کاشی کے جس مندر کے انہدام

کاالزام اورنگ زیب کے سر رکھا جاتا ہے، وہ مندر ملک مخالف سازشوں اور بدکاریوں کا اڈہ بن گیا تھا۔ چنانچہ ایک انگریز سیاح ہملٹن نے اورنگ زیب کے عہد حکومت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے: ”ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور پر برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور اسی طرح تہوار مناتے ہیں جیسے اگلے زمانے میں مناتے تھے“۔

(اسلام اور غیر مسلم: ۲۲۴)

اگر اورنگ زیب عالم گیر مندر شکن اور ہندو دشمن ہوتا تو وہ کیوں بنارس کے حاکم ابوالحسن کے نام فرمان جاری کر کے یہ کہتا کہ ”ہماری پاک شریعت اور سچے مذہب کی رو سے یہ ناجائز ہے کہ غیر مذہب کے قدیم مندروں کو گرایا جائے۔۔۔۔۔۔ یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ سے کوئی شخص ہندوؤں اور برہمنوں کو کسی وجہ سے بھی تنگ نہ کرے اور نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرے۔“

اورنگ زیب کے دور حکومت میں غیر مسلموں کو بڑے اعزازات و مناصب بھی دیے گئے، گورنر، جنرل، وائسرائے اور کمانڈر انچیف جیسے قابل قدر عہدے ان کے سپرد کئے گئے۔ اچاریہ پر فلا چندرائے کے مطابق ”شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں سلطنت کے اندر بڑی بڑی ذمہ داری کے عہدے ان کو ملے ہوئے تھے“۔

ان کے علاوہ دیگر تمام مغل بادشاہوں نے بھی ہندوؤں کے ساتھ روادارانہ اور برادرانہ سلوک کیا ہے۔ اور انہیں برابر کا شہری سمجھتے ہوئے ہر طرح کے جائز حقوق سے نوازا ہے؛ غیر مغل مسلم بادشاہ شیر شاہ سوری بھی بڑا انصاف پرور اور روادار تھا۔ وہ خود کو ہر مذہب کا حاکم اور سرپرست تصور کرتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ اگر کسی نے بھی میری رعایا کے کسی فرد پر ظلم کیا تو میں اس پر بجلی بن کر گروں گا اور اس کو مٹا کر ہی دم لوں گا۔ شیر شاہ سوری کے فرمان میں یہ درج تھا کہ ”غیر مسلموں کی عبادت گاہیں بالکل محفوظ رہیں۔ ان عبادت گاہوں کی جو مسلم حاکم حفاظت نہیں کرے گا اسے معزول کر دیا جائے“۔

(ٹی لیون: ۷۳)

عہد وسطیٰ میں مسلم حکمرانوں کی رواداری، رعایا نوازی اور خیر سگالی کی یہ ایک جھلک ہے۔ اس کا تفصیلی مطالعہ بہت سے مخفی گوشوں سے پردہ اٹھائے گا۔ جس کو الزامات کی دبیز چادر میں ڈھک دیا گیا ہے۔ اگر ہم کھلے ذہن کے ساتھ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے نظامہائے حکومت اور اس وقت کے حکام کی روشن زندگیوں کے خدوخال کا مطالعہ کریں تو ہمارے مؤرخین اور سیاست دانوں کو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی کہ محمود غزنوی سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سارے مسلم حکمراں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی سماج کے حقوق و واجبات کے تئیں مخلص اور روادار تھے۔ انھوں نے طبقاتی اور سماجی بنیادوں پر حکومت نہیں کی ہے، بلکہ مساوات اور برابری ان کی حکومت کا نشان تھا۔ ہمیں غور کرنے پر ان کے عہد حکومت میں خوش خوئی، خیر سگالی بقائے باہم اور رواداری کی ایسی نظیریں ملیں گی جن کی مثال پیش کرنے سے جمہوریت اور سیکولرازم کا دم بھرنے والی یہ مہذب دنیا قاصر ہوگی۔

اگر اس زوال آمادہ عہد میں بھی ان کے اختیار کردہ نظام حکومت کو منزل کا نشان تصور کر لیا جائے اور جمہوریت و سیکولرازم کا دم بھرنے والی یہ دنیا ان کی پالیسیوں کو بنیاد بنا کر اپنی سیاسی اور معاشی پالیسی ترتیب دینے لگے تو نہ صرف یہ کہ نفرت و دشمنی اور بغض و عداوت کی افسردہ اور مسموم فضاؤں میں اخوت و محبت اور مودت و عطوفت کی خوشبو بکھیری جا سکتی ہے، بلکہ معاشی کساد بازاری اور عالمی دہشت گردی کے بھوت سے خوف زدہ اس دنیا کو ہمہ جہت ترقی کی راہ پر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ ماضی کی شاندار روایات سے روشنی لے کر ہی ہم، مستقبل کی راہوں میں آنے والی ظلمتوں کے قافلے سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور زندگی کی شب تاریک کو تابناک سحر میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ جامع مسجد کے بلند و بالا منارے، تاج محل کا حسن اور لال قلعے کی مضبوط سرخ دیواریں یہی کچھ ہمارے وقت کے حکمرانوں سے کہہ رہی ہیں۔ کاش کوئی ان کی آواز پر کان دھرتا، تاکہ جنت نشاں ہندوستان کے سر سے فرقہ پرستی اور نفرت و عداوت کے ناپاک اور منحوس سایے کا خاتمہ ہوتا اور کیا رام اور کیا رحیم، سبھی بھائی بھائی کی طرح رہتے۔ اور ملک و معاشرے کی تعمیر و ترقی میں باہمی تعاون اور خیر سگالانہ جذبات کا مظاہرہ کرتے۔

☆☆☆

امام احمد رضا: اور علماے متقدمین پر تطفلات

علامہ محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

وکیل بالنکاح کو شرعاً اتنا اختیار ہے کہ وہ خود نکاح پڑھائے وہ دوسرے کو نکاح پڑھانے کی اجازت نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کو مطلقاً یا صراحۃً دوسرے کو وکیل بنانے کی اجازت نہ مل جائے۔ اس کے بغیر اگر دوسرے وکیل نے پہلے وکیل کی موجودگی میں نکاح پڑھایا اور پہلے وکیل نے اسے اس کی اجازت دے دی تو مذہب صحیح پر نکاح تو منعقد ہو جائے گا لیکن یہ نکاح بلا اذن ہوگا۔ یعنی یہ نکاح نکاح فضولی ہوگا اور نکاح فضولی باجماع ائمہ حنفیہ منعقد ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ نکاح اجازت اصیل پر موقوف رہتا ہے، اگر وہ اجازت دے، نافذ ہو جائے گا، اور رد کر دے تو باطل ہو جائے گا۔ یہی ائمہ مذہب اور جمہور علما اور محرر مذہب حضرت امام محمد رضی اللہ عنہ کا مذہب اور مفتی بہ قول ہے۔ (ماحي الضلالة في أنكحة الهند و بنجاله، مشمولہ فتاوی رضویہ، ۵/۱۰۳-۱۰۵، رضا اکیڈمی،)

مذکورہ مسئلے میں بعض حضرات نے اختلاف کیا اور کہا کہ وکیل اول کی موجودگی میں جس طرح بیع وشراء وغیرہ کا عمل وکیل ثانی کی طرف سے جائز و درست ہے، اس طرح وکیل ثانی کا عمل وکیل اول کی موجودگی میں نکاح، طلاق وغیرہ میں بھی جائز و درست ہے اس بارے میں ایک روایت نادرہ امام عصام سے آئی ہے اس کی بنیاد پر امام فقیہ النفس قاضی خان، صاحب قنیہ، اور علامہ سید احمد طحطاوی رحمہم اللہ تعالی نے جواز کا حکم دیا ہے۔

اب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی علمی جلالت کا اندازہ کریں کہ وہ اس پر کیا لکھتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

''حضرت امام محمد رضی اللہ عنہ نے اس مسئلے کا بیان اصل یعنی مبسوط میں واضح طور سے کر دیا ہے کہ وکیل اول کی موجودگی میں وکیل ثانی کا عمل بیع وشرا کے علاوہ میں جائز نہیں اور یہی صحیح ہے''۔

چناں چہ غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر میں مبسوط کے حوالے سے ہے:

''ذكر محمد في الأصل أنه لا يجوز فإنه قال إذا فعل الثاني بحضرة الأول لم يجز إلا في البيع والشراء وهو الصحيح. اهـ''۔

(غمز عیون البصائر، کتاب الوکالۃ، ۲/۱۱۔)

آپ فرماتے ہیں: یہ بات مسلم ہے کہ جب اصول کی روایات کی نفی ہو جائے تو اس صورت میں باقی تمام روایات جو اس کے خلاف ہیں ساقط و ناقابل حجت ہو جاتی ہیں اور مسئلہ دائرہ میں جب اصل کی روایت کی تصحیح ہو گئی تو اس کے برخلاف امام عصام کی روایت نادرہ ساقط ہے اور اس کی بنیاد پر خانیہ میں جو حکم دیا گیا وہ بھی ساقط ہے اور قنیہ تو خانیہ وغیرہ سے بہت کم درجے کی ہے اگر چہ علامہ طحطاوی نے اس کی تائید کی ہے اور صاحب بحر و صاحب در مختار نے اسے ''مشکل'' قرار دیا ہے۔

لیکن اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے امام قاضی خاں اور دیگر حضرات کے لیے یہ عذر پیش کیا ہے کہ انھیں اس وقت روایت اصل کی اطلاع نہ تھی، اس لیے کہ اگر انہیں اس کی اطلاع ہوتی تو

ضرور اس کا ذکر کرتے لیکن انھوں نے نہ اس کا ذکر کیا نہ اس کا کوئی اشارہ دیا، جس سے یہ شہادت فراہم ہوتی ہے کہ انھیں اس وقت روایت مبسوط کا علم نہ تھا۔

ہاں علامہ شامی کو اس کا علم تھا اس لیے کہ انھوں نے حاشیہ در میں علامہ رحمتی کی وہ عبارت نقل کی ہے جس میں انھوں نے حاشیہ حموی علی الاشباہ کے حوالے سے اصل (مبسوط) کی روایت ذکر کی ہے اور مختصر عصام کی روایت بھی ذکر کی ہے۔ اسے نقل کرنے کے بعد علامہ شامی نے لکھا ہے:

فيمكن أن يكون ما في القنية متفرعا على رواية عصام، لكن الأصل وهو المبسوط من كتب ظاهر الرواية، فالظاهر عدم الجواز، فافهم. (رد المحتار - كتاب النكاح، باب الولي).

(ترجمہ) ہوسکتا ہے کہ قنیہ میں جو حکم لکھا ہے وہ امام عصام کی روایت پر متفرع ہو، لیکن اصل یعنی مبسوط کتب ظاہر الروایہ سے ہے تو ظاہر یہ ہے کہ ایسا (یعنی وکیل اول کی موجودگی میں وکیل ثانی کا عمل) جائز نہیں۔

اس پر امام احمد رضا کا کلام یہ ہے کہ جب علامہ شامی کے علم میں آ گیا کہ مختصر عصام کی روایت کے برخلاف، مبسوط کی روایت موجود ہے تو انھیں صاف یہ حکم کرنا چاہیے کہ وکیل اول کی موجودگی میں وکیل ثانی کا عمل ساقط ہے اور اسے وکیل کی حیثیت سے معاملہ عقد انجام دینا کسی طرح درست نہیں۔ اس کے بجائے انھوں نے صرف یہ کہا کہ ظاہر یہ ہے کہ جائز نہیں جب کہ ان کے لیے یہ جزم کا موقع تھا، نہ کہ صرف استظہار کا۔

اب اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے اصل الفاظ ملاحظہ کریں:

فإذا كان هذا هو مفاد الأصل وقد ذيل بالتصحيح فانقطع الخلاف واضمحلت الرواية النادرة وسقط ما في الخانية فكيف بما في القنية وإن أيده العلامة الطحطاوي وتركه العلامة البحر والمحقق العلائي في الدر مستشكلاً و لاغر و فقد شهدت كلماتهم رحمهم الله تعالى أنهم لم يطلعوا إذ ذاك على كلام الأصل أصلا حيث لم يلموا به إلماما ولا أشموا منه إشما ما ولكن العجب من خاتمة المحققين العلامة الشامي قدس سره السامي حيث أورد كلام الأصل ثم لم يسمح إلا باستظهار عدم الجواز مريدا به عدم النفاذ إذ العقد عقد فضولي فكأنه اقتصر على النقل عن العلامة مصطفى ولو راجع الغمز لرأى تصحيح الإمام الولوالجي لما في الأصل. اهـ. ((1)-فتاوی رضویہ ۱۰۴/۵، رضا اکیڈمی، ممبئی ۳)

اس بحث سے متعلق بقیہ گفتگو دوسرے عنوان کے تحت گزر چکی ہے۔

زید نہایت بدچلن تھا اب وہ مفقود الخبر ہے اور زید کی عورت کو گزر اوقات کرنا دشوار ہو گیا ہے، نیز زید کے باپ نے اس عورت کو نظر بد سے دیکھا اور اس سے زنا بھی کیا۔ اس صورت میں وہ عورت اپنی گزر اوقات کے لیے اور اس حرام کاری سے بچنے کے لیے اپنا نکاح کرنا چاہتی ہے، تو کیا وہ کر سکتی ہے؟

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ اس کا ایک نہایت جامع و مانع اور محتاط جواب تحریر فرماتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

معاذ اللہ اگر یہ زنا ثابت ہو گیا، حالاں کہ اس کا ثابت ہونا بہت دشوار امر ہے، تو عورت اپنے شوہر زید پر ضرور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی، لیکن اس کے باوجود وہ نکاح سے خارج نہ ہوگی، جب تک زید اپنی زبان سے اسے چھوڑنے کا کوئی لفظ نہ کہے اس وقت تک وہ کسی دوسرے سے نکاح نہیں کر سکتی اور یہاں جب کہ شوہر مفقود ہے اور حرمت موجود ہے تو اس صورت میں لازم کہ وہ عورت کسی حاکم شرع کے حضور مرافعہ کرے اور وہ حاکم ثبوت لے اگر دو گواہان عادل سے پدر زید کا زید کی عورت سے فعل بد کا ارتکاب ثابت ہو جائے تو ان دونوں میں تفریق کر دے اور روز تفریق سے عورت تین حیض کی عدت گزارے، اس کے بعد وہ عورت نکاح ثانی کر سکتی ہے۔"

[فتاوی رضویہ، کتاب النکاح باب المحرمات، ۳۰۲،۳۰۳/۵، ملخصا]

اس جواب کے ضمن میں یہ بات گزری کہ شوہر جب تک کوئی لفظ اسے چھوڑنے کا زبان سے نہ کہہ لے تب تک وہ نکاح سے باہر نہ

ہوگی جسے فقہا کی اصطلاح میں متارکہ کہتے ہیں۔ اور جمہور فقہا کا یہ مذہب ہے کہ متارکہ صرف مرد کے ساتھ خاص ہے، عورت کا اس میں کوئی دخل نہیں، طلاق کی طرح، جس کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے درمختار اور شامی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

چناں چہ آپ رقم طراز ہیں:

قال الشامي خص الشارح المتاركة بالزوج "كما فعل الزيلعي لأن ظاهر كلامهم أنها لا تكون من المرأة أصلاً مع أن فسخ هذا النكاح يصح من كل منهما بمحضر الآخر اتفاقا. والفرق بين المتاركة والفسخ بعيد، كذا في البحر. وفرق في النهر بأن المتاركة في معنى الطلاق فيختص به الزوج. أما الفسخ فرفع العقد فلا يختص به وإن كان في معنى المتاركة. اهـ. ۱۳)

امام زیلعی وصاحب بحر الرائق و نہر الفائق کا مذہب یہ ہے کہ متارکہ صرف شوہر کا حق ہے اور متارکہ اور فسخ میں بہت بڑا فرق ہے کیوں کہ متارکہ طلاق کی طرح ہے؛ اس لیے اس کا حق صرف اور صرف شوہر کو ہوگا اور فسخ نکاح کو کالعدم قرار دینے کا نام ہے اس لیے یہ صرف شوہر کے ساتھ خاص نہ ہوگا۔

امام خیر الدین رملی اور علامہ شامی پر تطفل امام خیر الدین رملی نے ان حضرات کے بیان کردہ فرق کو نادرست ٹھہرایا اور کہا: کہ "فاسد نکاح میں طلاق کی ضرورت نہیں ہوتی تو وہاں متارکہ، طلاق کے معنی میں کیسے کہا جا سکتا ہے، لہٰذا حق یہی ہے کہ متارکہ اور فسخ میں کوئی فرق نہیں، تو جس طرح فسخ کسی ایک کے ساتھ مختص نہیں، اسی طرح متارکہ بھی صرف مرد کے ساتھ خاص نہ ہوگا"۔

علامہ شامی نے اس مسئلہ میں امام خیر الدین رملی کی تائید کی ہے:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں: "فقہائے کرام کے کلام سے متارکہ کا خاوند کے ساتھ خاص ہونا ہی ثابت ہوتا ہے، اور اس کے خلاف کی بو تک محسوس نہیں ہوئی اور صاحب نہر الفائق کی عبارت کا وہ مطلب نہیں ہے جس کو امام خیر الدین رملی نے اخذ کیا ہے اور اس کی علامہ شامی نے تائید کی ہے"۔ پھر آپ مزید فرماتے ہیں: "علامہ شامی نے خیر الدین رملی کی جو دلیل ذکر کی ہے، وہ تو خود ان کے حق میں نہیں ہے، بلکہ ان کے خلاف ہے"۔

چناں چہ آپ رقم طراز ہیں:

ذكر فيه استناد الرملي بما ليس له بل عليه كما بينه في منحة الخالق، وبالجملة فلا يثبت من كلامهم إلا اختصاص الزوج بالمتاركة، ثم لا يشم خلافه أصلا، أقول: وقول النهر إن المتاركة في معنى الطلاق، معناه أن المتاركة في الفاسد في معنى الطلاق في الصحيح فلا يمسه ما ذكر الرملي وأيده الشامي. اهـ.۱)

لہٰذا امام خیر الدین رملی نے جو یہ بیان کیا کہ فسخ و متارکہ میں کوئی فرق نہیں اور صاحب نہر الفائق کی عبارت پر اشکال قائم کر کے اپنا یہ موقف قائم کیا اور علامہ شامی قدس سرہ السامی نے اس کی تائید کی، یہ ایک بے جا اشکال ہے جس کو نہر الفائق کی عبارت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور علامہ شامی کی تائید بلا دلیل ہے جس کو بحث سے تعلق نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ متارکہ کا حق صرف شوہر کو ہے عورت کا اس میں کوئی دخل نہیں اور یہی فقہائے کرام کا مفتی بہ مذہب ہے۔ اس مسئلہ سے متعلق کچھ اور بحث ایک دوسرے عنوان کے تحت گزر چکی ہے)

شخص واحد کا نکاح کے دونوں طرفوں کا ذمہ دار ہونا جب کہ وہ ایک طرف سے اصیل اور دوسری طرف سے ولی یا وکیل ہو، ایسے ایجاب کے ساتھ جو قبول کے قائم مقام ہو، جیسے ابن العم نے گواہوں کے سامنے کہا: "زوجت بنت عمي فلانة من نفسي جائز و نافذ ہے یا نہیں؟

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "صورت مسئولہ میں اگر بنت عم نابالغہ ہے اور اس کا اس ابن عم سے زیادہ قریبی کوئی ولی حاضر نہیں ہے، یا وہ لڑکی بالغہ ہے اور ابن عم نے خاص اپنے ساتھ نکاح کرنے کا اس سے اذن لے لیا ہے، عام ازیں کہ اس کے لیے اور ولی اقرب ہو

یا نہ ہو، فإن هذه وكالة ولا ولاية مجبرة على البالغة، تو ائمہ ثلاثہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے نزدیک یہ شخص کہ ایک جانب سے اصیل دوسری طرف سے ولی یا وکیل ہے، طرفین نکاح کا متولی ہو سکتا ہے۔ پھر امام احمد رضا قدس سرہ نے اس کو متعدد کتب معتمدہ کے جزئیات سے مدلل ومبرہن فرمایا۔ اور پھر فرمایا: "ان صورتوں میں تنہا اس کی عبارت قائم مقام عبارتین ایجاب وقبول ہو جائے گی اور دوسری عبارت کی اس میں کوئی حاجت نہیں۔"

(1)۔فتاوی رضویہ، کتاب النکاح، باب المحرمات، ۳۰۳/۵)

ہدایہ میں ہے:

إذا تولى طرفيه، فقوله: "زوجت" يتضمن الشطرين ولا يحتاج إلى القبول۔ چاہے وہ شخص وہ لفظ ادا کرے، جن میں وہ اصیل ہے، مثلاً: " تزوجت یا وہ جس میں ولی یا وکیل ہے۔ مثلاً: " زوجت" تلخیص) (فتاوی رضویہ، كتاب النكاح، ۹۱، ۹۰/۵، مطبوعہ رضا اکیڈمی، ممبئ)

امام شیخ الاسلام بکر خواہر زادہ نے دوسری صورت یعنی "زوجت" کہنے میں اختلاف کیا اور کہا: "جب وہ شخص اپنے اصیل ہونے کو تعبیر کرے یعنی وہ یہ کہے: "میں نے نکاح کیا تب تو جائز ہے۔ اور اگر وہ شخص اپنے نائب ہونے کو تعبیر کرے اور کہے: "زوجت" تو یہ کافی نہیں۔"

چناں چہ فتاوی رضویہ میں فتح القدیر کے حوالے سے ہے:

قال شيخ الاسلام خواهر زاده هذا إذا ذكر لفظا هو أصيل فيه، أما إذا ذكر لفظا هو نائب فيه فلا يكفي، فان قال: "تزوجت فلانة كفى، وإن قال: زوجتها من نفسي لا يكفي، لأنه نائب فيه. اهـ. (ایضاً)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ نے شیخ الاسلام بکر خواہر زادہ کی اس عبارت پر کئی طرح سے کلام فرما کر اس عبارت کے ضعف کو ظاہر کیا اور فرمایا: "ہدایہ کی جو عبارت پیش ہوئی وہ اس بات کی نفی میں صراحتا دلالت کر رہی ہے۔ اور تجنیس میں بھی اس بات کی نفی پر صراحت موجود ہے، اور درمختار وغیرہ معتبر کتابوں میں اس کو معتمد علیہ قرار دیا ہے اور بحر الرائق وغیرہ میں اس کے خلاف کو ضعیف ظاہر کیا ہے۔"

چناں چہ آپ رقم طراز ہیں:

وعبارة الهداية وهي ما ذكرناه آنفا صريحة في نفي هذا الاشتراط، وصرح بنفيه في التجنيس أيضا في علامة غريب الرواية والفتاوى الصغرى. اهـ

.قلت: "وعلى هذا عول في الدر وغيره من المعتبرات وأفاد البحر وغيره ضعف خلافه . اهـ. (ایضاً)

اب اس مسئلے کے تعلق سے یہ بات رہ جاتی ہے کہ گواہوں کے سامنے اس لڑکی کا ممتاز ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ یعنی گواہوں کا یہ جاننا کہ فلاں لڑکی کا نکاح ہو رہا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا اس سلسلے میں فرماتے ہیں: "گواہوں کے سامنے اس لڑکی کا ممتاز ہونا ضروری ہے تا کہ کسی قسم کی جہالت باقی نہ رہے۔ اور اگر وہ لڑکی جس کا نکاح ہو رہا ہے، مجلس میں موجود نہیں ہے اور اس کی آواز بھی نہیں سنی جا سکتی ہے، نیز اس کی طرف سے اس کا نکاح اس کا وکیل کر رہا ہے تو اگر گواہ اس عورت کو جانتے ہوں تو نکاح میں صرف اس عورت کا نام ذکر کر دینا کافی ہے جب کہ گواہوں کو اس بات کا علم ہو کہ وکیل کی مراد وہی عورت ہے، جس کو وہ لوگ جانتے ہیں۔ اور اگر گواہ اس عورت کو نہ پہچانتے ہوں تو عورت، اس کے والد اور اس کے دادا کا نام ذکر کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر اس کا نکاح صحیح نہ ہوگا۔

چناں چہ آپ رقم طراز ہیں:

البتہ شہود کے سامنے منکوحہ کا متمیز ہو جانا ضرور ہے، حتی لو كانت حاضرة متنقبة كفت الاشارة، وإن كان الأحوط كشف الوجه، پس اگر بحالت غیبت صرف بنت عمی (کہا) یا فلانہ یا بنت عمی فلانہ یا ان کے مثل جس لفظ سے شہود اسے متمیز کر لیں تو اسی قدر کافی ورنہ ذکر اب وجد یعنی فلان بنت فلان بن فلاں کہنا ضروری ہے۔ اھ۔ (۔فتاوی رضویہ، ۹۷۵، رضا اکیڈمی ممبئ)

پھر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی نے اس مسئلے کو کثیر جزئیات سے مدلل و مبرہن فرمایا۔

مگر حضرت امام خصاف نے کہا: کہ ان آخری دونوں صورتوں میں بھی نام کا ذکر کرنا ضروری نہیں بلکہ بغیر نام ذکر کیسے بھی نکاح جائز ہے“۔

چناں چہ اس میں ردالمختار کے حوالے سے ہے:

في البحر ... وجوز الخصاف النكاح مطلقا حتى لو وكلته فقال بحضرتهما: زوجت نفسي من موكلتي أو من امرأة جعلت أمرها بيدى فإنه يصح عنده. اهـ)

علامہ ابن نجیم حنفی صاحب بحر الرائق مذکورہ عبارت سے آگے امام خصاف کے بارے میں امام قاضی خان اس کا ایک قول نقل فرماتے ہیں:

قال قاضي خان والخصاف كان كبيرا في العلم يجوز الاقتداء به، وذكر الحاكم الشهيد في المنتقى كما قال الخصاف. اهـ. (ایضاً)

اب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی فقہ میں گہرائی و گیرائی، دقت نظر، جودت فکر، وسعت مطالعہ اور عبارات فقہائے کرام پر گہری نظر کا جلوہ ملاحظہ کریں۔

سب سے پہلے آپ نے امام خصاف کے قول کا رد فرمایا، اور فرمایا: کہ امام خصاف کا قول مرجوح ہے اور تمام کتب متون ان کے قول کے خلاف ہیں اور متون کے مقابل ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں، اگر چہ ان کا علم میں بڑا مقام ہے۔

چناں چہ آپ رقم طراز ہیں:

قلت: وفي التتارخانية عن المضمرات أن الأول هو الصحيح وعليه الفتوى، وكذا قال في البحر في فصل الوكيل والفضولي: إن المختار في المذهب خلاف ما قاله الخصاف وان كان الخصاف كبيرا. اهـ. (ایضاً)

پھر امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں: کہ بحر الرائق میں امام اجل قاضی خان اس کی طرف جو قول منسوب ہے، اصل میں وہ امام قاضی خان کا اپنا قول نہیں ہے بلکہ اس کو امام قاضی خان نے امام شمس الائمہ سرخسی سے نقل کیا ہے لیکن خود امام قاضی خاں کا موقف عدم صحت ہے۔ یعنی ان مذکورہ دو صورتوں میں اگر اس کا نام نہ لیا جائے یا اس کے والد اور دادا کا نام نہ لیا جائے تو نکاح جائز نہیں، اس پر دلیل یہ ہے کہ امام قاضی خاں کی عادت کریمہ یہ ہے کہ وہ اپنی کتاب میں اسی قول کو مقدم کرتے ہیں جو ان کے نزدیک مفتی بہ ہوتا ہے، اور انھوں نے اپنی کتاب میں اس قول کو مقدم کیا ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کے نزدیک مفتی بہ قول یہی عدم صحت ہے۔

چناں چہ امام احمد رضا قدس سرہ رقم طراز ہیں:

أقول: وما عزا في البحر للامام قاضي خان فإنما نقله قاضي خان عن الإمام شمس الأئمة السرخسي، أما هو بنفسه فقد قدم عدم الصحة ومعلوم أنه إنما يقدم ما يعتمده. اهـ. (ایضاً)

زید نے اقرار کیا کہ یہ میری بیوی ہے اور ہندہ نے بیان کیا کہ یہ میرا خاوند ہے، یہ قیل وقال گواہوں کی موجودگی میں ہوا، تو کیا ان الفاظ سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے؟ نیز اس میں مہر کا ذکر نہیں ہوا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے جواب کا خلاصہ ملاحظہ کریں۔ آپ فرماتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ نکاح حکم قضا میں تصادق مرد و زن سے ثابت ہو جاتا ہے یعنی جب وہ دونوں اقرار کریں کہ ہم زوج و زوجہ ہیں یا ہمارا نکاح آپس میں ہو گیا ہے یا دوسرے ایسے الفاظ جو اس معنی کو ادا کرتے ہوں تو بلا شبہ انھیں زوج و زوجہ جانیں گے اور قضاء تمام احکام زوجیت ثابت ہوں گے بلکہ لوگوں کے نزدیک اس سے بھی کم تر امر ثبوت نکاح کے لیے کافی ہوتا ہے، اسی طرح تسامح بھی سامعین کے نزدیک اثبات نکاح کے لیے کافی ہوتا ہے، جب ان کا زوج و زوجہ ہونا لوگوں میں مشہور و معروف ہو۔ اس کے باوجود حکم قضا اور چیز ہے اور امر

دیانت اور چیز۔ اگر وہ اپنے اس اظہار داخبار میں حقیقہ سچے ہوں یعنی واقع میں ان کے باہم نکاح ہو گیا ہے تو عند اللہ بھی زوج وزوجہ ہیں، ورنہ محض ان الفاظ سے جب کہ بطور اخبار بیان میں آئے ہوں، نکاح منعقد نہ ہوگا، وہ بدستور اجنبی واجنبیہ ہی رہیں گے، نکاح جن امور وافعال کو ثابت وحلال کرتا ہے، دیانہ ان کے لیے اصلا ثابت نہ ہوں گے کہ اس تقدیر پر یہ الفاظ کوئی عقد وانشانہ تھے، محض جھوٹی خبر تھی اور جھوٹی خبر دیانۃ باطل و بے اثر۔ علما تصریح فرماتے ہیں: کہ "اگر شوہر نے اقرار طلاق کیا کہ میں اسے طلاق دے چکا ہوں اور واقع میں طلاق نہیں دی تھی تو اگر چہ قضاء طلاق ہوگئی مگر دیانت ہرگز طلاق نہ ہوگی۔ کیوں کہ اس کا یہ قول طلاق دینا نہ تھا بلکہ طلاق غیر واقع کی جھوٹی خبر دینا تھا تو جب اقرار خلاف واقع سے عند اللہ طلاق واقع نہیں ہوتی تو نکاح بدرجہ اولی منعقد نہ ہوگا کہ طلاق سبب تحریم فرج ہے اور نکاح سبب تحلیل اور امر فرج میں احتیاط جلیل۔ اس لیے عامتہ علماء متون وشروح وفتاوی میں تصریح فرماتے ہیں کہ محض اقرار مردوزن سے نکاح ہرگز منعقد نہیں ہوتا"۔ (تلخیص) (فتاوی رضویہ، کتاب النکاح، ۹۴/ ۵ - ۹۶، رضا اکیڈمی ممبئی ۳)

پھر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے اس کو بیس (۲۰) کتب معتمدہ کے جزئیات سے مدلل فرمایا۔

اس کے برخلاف امام برہان الدین محمود بن الصدر السعید تاج الدین احمد صاحب ذخیرہ قدس سرہما نے کہا: اصح یہ ہے کہ یہ مردوزن کا اقرار اگر گواہوں کی موجودگی میں ہو تو نکاح صحیح ہے اور اقرار کو انشا قرار دیا جائے گا"۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے امام برہان الدین اس کے اس قول پر ایک تفصیلی اور تحقیقی کلام فرمایا ہے اور یہ ثابت فرمایا ہے کہ صاحب ذخیرہ کا یہ قول کسی بھی طرح قابل قبول نہیں اور اس کا ضعف کئی طرح سے ظاہر ہے۔

آپ نے فرمایا: "امام برہان الدین کے اس قول کی بنیاد امام محمد رضی اللہ عنہ کی کتاب مبسوط کے ایک قول پر ہے اور وہ یہ ہے کہ "ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ "فلاں عورت اس کی بیوی ہے اور عورت ان سے انکار کر رہی ہے تو اس شخص نے عورت سے سو روپے کے بدلے صلح کر کے اس سے نکاح کا اقرار کرا لیا تو اس صورت میں عورت کا اقرار جائز ہے اور مال لازم ہو جائے گا۔ اس عبارت سے علامہ برہان الدین نے یہ یقین کر لیا کہ "یہ اقرار گواہوں کی موجودگی میں ہو تو نکاح صحیح ہوگا" اسی لیے انھوں نے یہ تفریع قائم کی کہ اصح بات یہ ہے کہ گواہ موجود ہوں تو اقرار سے نکاح صحیح ہوگا۔ مگر عبارت مبسوط سے یہ مطلب لینا لغزش فہم پر مبنی ہے"۔

چناں چہ آپ رقم طراز ہیں:

"قد أظهر لنا المولى الإمام برهان الدين محمود بن الصدر السعيد تاج الدين أحمد قدس سرهما في ذخيرته مأخذ خيرته إذ بنى ذلك على أنه ذكر محرر المذهب محمد رضى الله تعالى عنه في صلح الأصل ادعى رجل على امرأة نكاحا، فجحدت فصالحها بمائة على أن تقر بهذا فاقرت فهذا الاقرار جائز والمال لازم. اهـ . ، فظن المولى البرهان ان محمدا أجاز النكاح بالإقرار وقد علم أن هذا العقد لا يصح إلا بمحضر من الشهود ففرع عليه أن الأصح الصحة لو الشهود حضوراً. اهـ. (فتاوى رضويه ، كتاب النكاح ، ۹۷/ ۵ - ۹۸، رضا اکیڈمی، ممبئی ۳)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ فرماتے ہیں: "علامہ برہان الدین کا اپنے قول کی بنیاد قول امام محمد کو بنانا ہی درست نہیں کیوں کہ امام محمد رضی اللہ عنہ کے اس قول کا اس بحث سے کوئی تعلق ہی نہیں کیوں کہ امام محمد نے صرف اقرار کو جائز رکھا اور مال کو لازم قرار دیا ہے، جس کا مفاد صرف اور صرف صلح کا جواز اور جھگڑا ختم کرنا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ عورت اس کے بعد دوبارہ انکار کرے تو قاضی اس کی سماعت نہیں کرے گا۔

چناں چہ آپ رقم طراز ہیں:

أقول وبالله التوفيق: لامساس لما في الأصل بهذا الفصل فإن محمدا إنما أجاز الإقرار وألزم المال فإنما أفاد جواز الصلح وانقطاع الجدال بحيث لو عادت المرأة بعد ذلك الى الجحود لم يسمعه القاضي، أما لو لم يجز الصلح لم يلزم المال وأقرت المرأة على إنكارها هذا هو حاصل جواز الصلح وعدم جوازه كما لا يخفى وأين هذا من انعقاد العقد في الواقع فيما بينهم وبين ربهم العليم الخبير تبارك وتعالى أليس قد صرحوا أنه لا يطيب له البدل إن . ثم السرآن المصالحين أرادا عقد الصلح وهو إنما يصور بإرجاعه الى عقد من العقود الشرعية فلابد من حمله على اشبه عقد به ضرورة تصحيح الكلام وقطع الخصام، أما ههنا أعني فيما نحن فيه فلم يريدا عقدا وإنما أخبرا به خبرا كذبا والكذب وإن يرج على الناس فلا يصح عند الله أصلا فوضح الفرق وزال الاشتباه، والحمد لله . اهـ. (فتاوى رضو به، كتاب النكاح، ۹۸/ ۵، رضا اکیڈمی ممبئی ۳)

اس کے بعد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے متعدد مثالوں اور جزئیات سے اس کی وضاحت فرمائی کہ امام محمد کے اس قول کا اس بحث سے کوئی لگاو نہیں ہے۔ (ملاحظہ کریں: فتاوی رضویہ، کتاب النکاح، ۹۸/ ۵ - ۹۹، رضا اکیڈمی، ممبئی ۳)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے علامہ برہان الدین کی اس عبارت کا کہ "اقرار گواہوں کی موجودگی میں ہونے سے نکاح صحیح ہے" کئی طرح سے رد فرمایا چناں چہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

فاعلم أولا أن المولیین المحققین [أي العلامة الغزي صاحب التنوير، والعلامة الحصكفي صاحب شرحه] قد أشارا إلى تضعيف هذا بوجوه. أما المصنف فبتقديمه الأول، وتعبيره هذا بقيل، وأما المؤلف فبتقديره على الأمرين وتعليله للأول، فان التعليل دليل التعويل، كما نص عليه في العقود الدرية وغيرها، فافهم.

وأما ثانيا: فلما له من كثرة الترجيحات وقد تقرر أنَ العمل بما عليه الأكثر كما في العقود وغيرها.

وأما ثالثا: فلأن ماله من علامة الإفتاء أشد قوة وأعظم وقعة مما لهذا فقد نصوا أن عليه الفتوى وبه يفتي أكد ما يكون من ألفاظ الفتوى

وأما رابعا: فلأن عليه المتون وهي العمدة وإليها الركون فهذه الأربعة قد ظهرت من قبل. اهـ. ۱۳)

پھر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ اخیر میں اتنے دلائل وشواہد کے بعد فرماتے ہیں: مذکورہ تفصیل سے علامہ برہان الدین کی دلیل کے تین جواب ہوئے جو انھوں نے حضرت امام محمد رضی اللہ عنہ کے قول پر اپنے قول کی بنیاد رکھی تھی، کیوں کہ یہ بنیاد ہی باطل ہے اور محرر مذہب حنفیہ امام محمد رضی اللہ عنہ کے قول کو اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔

چناں چہ آپ رقم طراز ہیں:

فيما اسمعتك يتحصل الجواب عن تمسك المولى البرهان بثلثة أوجه ـ الأول: ارجاع الصلح الى تلك العقود تقدير وتصوير ضروری فلا يتعدى. الثاني: إنما تثبت هذه العقود بتلك الألفاظ في ضمن الصلح وكم من شيء يثبت ضمنا ولا يثبت قصداً... الثالث: أن هذه العقود إنما تقدر قضاء ولا تؤثر في الديانة إذا كان مبطلا ونحن لا ننكر أن باقرارهما يثبت النكاح قضاء وإنما الكلام في الديانة. اهـ)

1) ـ فتاوی رضویہ، کتاب النکاح، ۹۷/ ۵، رضا اکیڈمی، ممبئی ۳ ـ

(2) فتاوی رضویہ، کتاب النکاح، ۹۸/ ۵ - ۹۹، رضا اکیڈمی، ممبئی ۳ ـ

□□□

امام احمد رضا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ عنہ

از:۔ کوثر امام قادری
دار العلوم قدوسیہ، پرسونی بازار، مہراج گنج، یوپی

بزرگوں کی سیرت وسوانح کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ کوئی بھی بزرگ شخصیت حاسدوں کی حسد سے محفوظ نہیں رہ سکی، جو جتنی ہی بلندی پر فائز ہوا، اتنی ہی اس کی مخالفت کرنے والے بھی دنیا میں نظر آئے۔ اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ ہمیشہ چھوٹوں نے ہی بڑوں سے حسد کیا۔ کبھی کسی بڑی شخصیت نے کسی چھوٹے سے نہ حسد کیا، نہ ہی ان سے نفرت کی، بلکہ ان کا شیوہ چھوٹوں کو نوازنا تھا۔

ان ہی عظیم شخصیات میں سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات بھی ہے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی احیائے سنت، تجدید دین، ترویج واشاعت قرآن وسنت میں صرف فرمائی۔ عظمت مصطفی کا علم بلند فرمایا، اولیائے اسلام کی قدر ومنزلت، وقار وحرمت کا چراغ لوگوں کے دلوں میں روشن کیا اور تحقیق مسائل کی راہیں روشن فرمائیں، لیکن سابقہ اشخاص کی طرح آپ کی ذات بھی حاسدوں کی حسد سے محفوظ نہ رہ سکی۔

آپ سے عناد رکھنے والے اور حسد کی آگ میں جلنے والے دو قسم کے افراد ہیں۔ ایک قسم حاسدین کی وہ ہے جو اہل سنت و جماعت کے خلاف عقائد کا پابند ہے مثلاً وہابی، دیوبندی، قادیانی، جماعت اسلامی، غیر مقلد وغیرہ، یہ تمام فرقے آپس میں اگرچہ مختلف نظریات اور متضاد اعتقاد کے پیروکار ہیں تاہم جب مخالفت رضا کی بات آتی ہے تو "الکفر ملۃ واحدۃ" کے تحت متحد ومتفق نظر آتے ہیں۔ چوں کہ اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے تمام گمراہ باطل فرقوں کی تردید فرمائی ہے لہذا ان کا مخالف ہونا لازمی امر ہے۔

باطل فرقے کا کوئی بھی علمبردار تحقیقات رضا، تحریرات رضا اور تصنیفات رضا کے سامنے آنے کی جرأت اور مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا اور حضرت امام کی بے داغ شخصیت وعبقری ہستی میں کہیں کوئی نقص وعیب نہیں پاتا تو لامحالہ الزام تراشی کی راہ اپناتا ہے، تاکہ حضرت امام کے فتاوی وتصانیف کی وقعت کو کم کیا جاسکے اور انھوں نے بدمذہبوں کے خلاف جو فتاوے جاری فرمائے ہیں، انھیں بے اعتبار ثابت کیا جاسکے۔

حاسدین کی دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو خیر سے مسلمان ہیں، مگر خدمت دین، ترویج سنت، اشاعت مذہب، تحفظ عقائد حقہ اور فروغ علم وعمل پر اپنی ذاتی منفعت اور مصنوعی تقویٰ وطہارت کو ترجیح دیتے ہیں۔ چوں کہ حضرت امام نے تجدید دین کا جو زبردست کام کیا اس کے سبب ہر طرف ان کی عظمت کے چراغ جل اٹھے۔ چہار سو ان ہی کا بول بالا ہونے لگا اور دنیائے علم وحکمت میں ان ہی کا سکہ رائج ہوگیا۔ پھر تو جو لوگ کوئی دینی کام کیے بغیر "پدرم سلطان بود" کا نعرہ لگا کر جھوٹی شہرت اور دولت وثروت کما رہے تھے، انہوں نے اپنے قدموں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس کی۔ مریدوں پر گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو ایسے حالات میں عوام کے دلوں میں اعلیٰ حضرت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنے اور فکر وتحقیق، علم وحکمت کے دھارے سے قوم مسلم کو الگ کرنے کے لیے حضرت امام پر الزام تراشی کرنے لگے اور ان کی پیروی میں ان کے ان پڑھ مریدین بھی وہی راگ الاپنے لگے۔

چنانچہ جس طرح حاسدین کی جماعت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، ٹھیک اسی طرح الزامات بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کی تشہیر کے لیے کتب ورسائل، اخبار وجرائد اور قرطاس وقلم کا

سہارالیا جاتا ہے اور دوسرے وہ ہیں جن کو پھیلانے کے لیے خفیہ نشستیں، خصوصی مجالس، مخصوص ملاقاتیں اور سرگوشی کے لیے ہلکی اور دبی زبانیں استعمال ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کے الزامات تراشنے والے باطل فرقے کے لوگ ہیں جب کہ دوسری قسم کی الزام تراشی والے اہلسنت ہی کے بعض لوگ ہیں۔

اعلیٰ حضرت پر الزام:

اہلسنت و جماعت کے بعض حاسدین سرکار اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کو حضور سیدنا سرکار خواجہ غریب نواز رضی اللہ عنہ سے عقیدت نہیں تھی۔ اسی لیے آپ نے کبھی اجمیر شریف کا سفر نہیں فرمایا اور نہ اپنی تصنیفات میں کہیں ان کا ذکر جمیل فرمایا۔

چوں کہ بات یہ سرگوشی کے انداز میں کہی جاتی ہے۔ اس لیے اثر انداز ہوتی ہے اور اس سے کہی جاتی ہے جو تصنیفات رضا کے مطالعہ سے قاصر ہے، لہذا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ اس الزام کی بنیاد جھوٹ کی زمین پر ہے اور اس کا تعلق حقیقت سے بالکل ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ متعدد شواہد اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے متعدد بار اجمیر مقدس کا سفر فرمایا اور آپ کو حضور غریب نواز سے بے پناہ عقیدت تھی۔

اجمیر شریف میں اعلیٰ حضرت کا خطاب:

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے متعدد بار اجمیر مقدس کا سفر کیا۔ عرس میں شرکت فرمائی اور بارگاہ غریب نواز میں حاضری کی سعادت سے فیضیاب ہوئے۔ ایام عرس میں سجادہ نشین کی طرف سے ہر سال شاہجہانی مسجد میں جلسہ کا اہتمام ہوتا۔ باہر سے آئے ہوئے خطبا، مقررین، سلطان الہند کے فضائل و مناقب بیان فرماتے۔

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ میدان قرطاس وقلم کے شہسوار تھے۔ فن خطابت وتقریر سے کوئی بہت زیادہ لگاؤ نہیں تھا، لیکن مخصوص مواقع پر علم وحکمت کے دھارے کو فن تقریر کی سمت بھی موڑ دیتے تو ایک بار پھر سامعین یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے۔

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آ گئے ہو سکّے بٹھا دیے ہیں

لہذا آپ جب بھی اجمیر القدس تشریف لے گئے، سجادہ نشین نے کرسی خطابت پر جلوہ گر ہونے کی درخواست کی اور آپ نے سلطان الہند کی غلامی کا ثبوت دیا۔ گھنٹوں تقریر فرمائی اور حضور غریب نواز کے فضائل ومناقب، سیرت وسوانح پر خصوصی خطاب فرمایا۔ علامہ نور احمد قادری پاکستانی لکھتے ہیں:

''اعلیٰ حضرت کا اکثر سلطان الہند خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیری کی خانقاہ میں عرس غریب نواز کے موقع پر وعظ ہوا کرتا تھا۔ اور اس وعظ کا اہتمام خود خانقاہ شریف کے دیوان صاحب کیا کرتے تھے جس میں علما، فضلا، دور دور سے آ کر وعظ سننے کے لیے شرکت کرتے، بعض دفعہ دکن کے حکمران نظام دکن میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خان بھی اس وعظ میں شریک ہوتے رہے۔ اعلیٰ حضرت کا وعظ سننے کے لیے بے شمار خلقت وہاں ہوا کرتی تھی۔''

(معارف رضا صفحہ (۱۵۵)

اجمیر شریف کا سفر اور ایک قابل ذکر ظہور کرامت:

علامہ نور احمد قادری فرماتے ہیں۔

''جب اعلیٰ حضرت بریلی شریف سے اجمیر شریف عرس خواجہ غریب نواز میں حاضری کے لیے جانے لگے تو ان کے ہمراہ دس گیارہ ان کے مریدین بھی تھے۔ ان ہی میں راقم الحروف کے استاد حضرت مولانا عبد الرحمن قادری جے پوری جو اعلیٰ حضرت کے شاگرد و خلیفہ تھے۔ دوسرے راقم الحروف کے دادا حاجی عبد القادر رحمۃ اللہ علیہما بھی تھے۔ بقیہ دوسرے حضرات تھے۔

دہلی سے اجمیر شریف جانے کے لیے بی بی اینڈ سی آئی آر ریل چلا کرتی تھی۔ اعلیٰ حضرت جب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ پھلسرہ جنکشن پہنچے تو مغرب کا وقت ہو گیا۔ آپ نے اپنے مریدوں سے فرمایا، نماز مغرب کے لیے پلیٹ فارم ہی پر جماعت کرلی جائے۔ چنانچہ چادریں بچھائی گئیں، لوگوں میں

سے جن کا وضو نہیں تھا انھوں نے تازہ وضو کیا۔ اعلیٰ حضرت باوضو تھے چوں کہ ہر وقت باوضو رہنے کی عادت تھی لہٰذا امامت کے لیے آگے بڑھے اور فرمایا،" آپ سب لوگ پورے اطمینان کے ساتھ نماز ادا کریں ان شاء اللہ گاڑی اس وقت تک نہیں جائے گی جب تک ہم لوگ پوری نماز نہ ادا کرلیں۔ یہ فرما کر آپ نے نماز شروع فرمادی۔ جب نماز کی ایک رکعت پوری ہوئی تو اس درمیان گاڑی کا وقت ہو گیا اور گاڑی نے سیٹی دیا۔ پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے لوگ ڈبوں میں سوار ہو گئے، مگر آپ کے ساتھی نماز پڑھنے والے انتہائی سکون وانہماک کے ساتھ ادائیگی نماز میں مصروف رہے۔ اب گاڑی نے پھر دوسری وتیسری سیٹی دی اور ڈرائیور نے گاڑی بڑھانا چاہا، مگر گاڑی آگے کو نہ بڑھ سکی۔ گاڑی چوں کہ میل" تھی ہزار کوشش کے بعد آگے نہ بڑھی تو تمام عملہ پریشان ہونے لگے کہ آخر گاڑی کیوں نہیں بڑھ رہی ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ انجن کو چیک کرنے کے لیے پیچھے بڑھاتا تو گاڑی پیچھے کی سمت چل پڑتی اور جب آگے چلنا ہوتا تو رک جاتی۔ آخر اتنے میں اسٹیشن ماسٹر جو انگریز تھا، اپنے کمرے سے باہر نکل کر آیا اور کہا کہ انجن کو گاڑی سے کاٹ کر دیکھو چلتا ہے یا نہیں۔ ڈرائیور نے ایسا ہی کیا تو انجن چلنے لگا، اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی مگر پھر جونہی ڈبوں کے ساتھ جوڑا پھر وہی حال۔ اب اور پریشانی بڑھی، اسٹیشن ماسٹر نے گارڈ سے پوچھا (حسن اتفاق وہ گارڈ مسلمان تھا اور وہیں کھڑا تھا جہاں نماز ہو رہی تھی) گارڈ نے بتایا کہ سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ بزرگ جو نماز پڑھ رہے ہیں، کوئی بہت بڑے اللہ کے ولی ہیں، گاڑی ان کی وجہ سے نہیں چل پا رہی ہے اور یہ بزرگ اور ان کی جماعت نماز نہیں ادا کرلیتی ہے یہ گاڑی مشکل ہی ہے کہ چلے۔

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے سلام پھیرا اور باآواز بلند درود شریف پڑھ کر دعا میں مصروف ہو گئے۔ جب دعا سے فارغ ہوئے تو انگریز نے بڑھ کر نہایت ادب سے عرض کیا۔ ذرا جلدی

"۔۔۔۔اب آپ ذرا غور کریں، اگر اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے دل میں خواجہ غریب نواز سے محبت نہ ہوتی یا کسی طرح کی نفرت کا جذبہ ہوتا یا انقباضی کا شکار ہوتے تو فوراً عرض کرتے، حضور! ہمارے لیے صرف سلسلہ قادریہ ہی کافی ہے دیگر سلاسل کی ضرورت نہیں۔ مگر ایسا کچھ نہیں کہا اور اگر از راہ ادب آپ نے عرض نہیں کیا تو کم از کم یہ کر سکتے تھے کہ کسی کو سلسلہ چشتیہ میں بیعت نہیں کرتے، سب کو سلسلہ قادریہ ہی کی طرف راغب کرتے، مگر تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اعلیٰ حضرت نے سلسلہ چشتیہ میں بھی لوگوں کو داخل فرمایا اور بعض سلسلہ چشتیہ کی سند و خلافت اور اجازت بھی عطا فرمائی۔۔۔۔"

فرمائیں، گاڑی آپ ہی کے انتظار میں کھڑی ہے۔ ارشاد فرمایا، ہم لوگ تھوڑی دیر میں نماز سے فارغ ہولیں گے پھر ان شاء اللہ گاڑی چلے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ نماز کا وقت ہے۔

آپ لوگوں نے جب نماز سے فراغت پالی اور آکر گاڑی میں فروکش ہو گئے تو پھر گاڑی چلنے لگی۔ انگریز نے ادب سے سلام کیا پھر آپ لوگ اجمیر مقدس کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس کرامت کا انگریز کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ وہ رات بھر سوچتا رہا اور اسلام کی حقانیت اس کے دل میں اپنی جگہ بناتی رہی، بالآخر وہ صبح کو اپنی جگہ پر دوسرے کو مقرر کر کے اپنے پورے گھر والوں کے ساتھ اجمیر القدس کے لیے چل پڑا تا کہ وہاں خواجہ غریب نواز کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے

دست مبارک پر اسلام قبول کرے۔ جب وہ اجمیر شریف پہنچا تو اس وقت درگاہ شریف کی شاہجہانی مسجد میں اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کا خطاب ہو رہا تھا۔ وعظ میں شریک ہوا، بیان سنا اور جب وعظ ختم ہوا تو قریب پہنچ کر اعلیٰ حضرت کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ جب سے آپ پھلسرہ اسٹیشن سے ادھر روانہ ہوئے ہیں، اسی وقت سے میں بے چین ہوں، سکون نہیں ملتا، آخر اپنے افراد خانہ کو لے کر یہاں حاضر ہو گیا ہوں اور اب آپ کے دست اقدس پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی یہ کرامت دیکھ کر اسلام کی صداقت وحقانیت کا مکمل یقین ہو گیا ہے۔

چنانچہ اعلیٰ حضرت نے ہزار ہا زائرین عرس کے سامنے اس انگریز کو اور اس کے نو افراد کو کلمہ پڑھا کر اسلام میں داخل فرمایا نیز اس کو سلسلہ قادریہ میں بیعت بھی فرمایا اور اس کا نام "رابرٹ سے بدل کر عبدالقادر رکھا۔ اور اس کو اسلام کی تعلیمات سے نوازا۔ (معارف رضا صفحہ ۱۵۶۔۱۵۷)

توجہ دیں:

1 اگر اعلیٰ حضرت کو خواجہ غریب نواز سے محبت نہیں ہوتی تو کثرت سے عرس غریب نواز میں شرکت کیوں کرتے بلا شبہ بار بار شرکت کرنا محبت خواجہ کی نشانی ہے۔

۲ اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے اجمیر مقدس میں جو متعدد تقریریں فرمائیں، وہ آج محفوظ تو نہیں ہیں لیکن بلا شبہ آپ نے سیدنا سرکار غریب نواز کے فضائل ومناقب بیان فرمائے۔ اگر آپ غریب نواز کے مناقب بیان نہیں فرماتے اور آپ کے دل میں ذرہ برابر بھی غریب نواز کے تعلق سے انقباض ہوتا تو قطعی طور پر متعدد تقریروں کا موقع ہی نہیں دیا جاتا اور حضرت خواجہ کے چاہنے والے قطعی آپ کی مجلس میں شریک نہیں ہوتے ۔یقیناً آپ کی متعدد تقریریں عشق خواجہ کی علامت ہیں۔

عرس میں شرکت کے لیے صرف تنہا نہیں جاتے بلکہ اپنے مریدوں اور ماننے والوں کو بھی ساتھ لے جاتے۔ کیا یہ محبت خواجہ کی پہچان نہیں ہے؟

سلسلہ چشتیہ کی سند وخلافت:

ملک العلماء علامہ ظفر الدین بہاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ۱۲۹۵ھ میں اپنے والد ماجد علامہ نقی علی خاں قدس سرہ العزیز کے ساتھ سرکار مارہرہ مطہرہ حاضر ہو کر تاجدار مارہرہ سید نا شاہ آل رسول احمدی قدس سرہ العزیز سے شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔

اللہ اکبر! کیسی نظر کیمیا اثر پیر ومرشد کی تھی اور کس درجہ قلب صفائی لے کر بیعت ہوئے تھے کہ اس جلسے میں پیر مرشد برحق نے تمام سلاسل کی اجازت وخلافت عطا فرما کر خلیفہ ومجاز بنا دیا اور تمام طریقوں میں بیعت لینے کی اجازت عامہ تامہ عطا فرمائی۔"

(حیات اعلیٰ حضرت جدید اول صفحہ ۱۳۲)

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کو آپ کے پیر ومرشد نے جہاں سلسلہ عالیہ قادریہ کے علاوہ ایک درجن سے زائد سلاسل کی اجازت وخلافت عطا فرمائی تھی، وہیں سلسلہ چشتیہ جدیدہ وقدیمہ کی بھی اجازت وخلافت سے نوازا تھا۔

اب آپ ذرا غور کریں، اگر اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے دل میں خواجہ غریب نواز سے محبت نہ ہوتی یا کسی طرح کی نفرت کا جذبہ ہوتا یا انقباضی کا شکار ہوتے تو فوراً عرض کرتے، حضور! ہمارے لیے صرف سلسلہ قادریہ ہی کافی ہے دیگر سلاسل کی ضرورت نہیں۔ مگر ایسا کچھ نہیں کہا اور اگر از راہ ادب آپ نے عرض نہیں کیا تو کم از کم یہ کر سکتے تھے کہ کسی کو سلسلہ چشتیہ میں بیعت نہیں کرتے، سب کو سلسلہ قادریہ ہی کی طرف راغب کرتے، مگر تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اعلیٰ حضرت نے سلسلہ چشتیہ میں بھی لوگوں کو داخل فرمایا اور بعض سلسلہ چشتیہ کی سند و خلافت اور اجازت بھی عطا فرمائی۔

ایک بات اور ذہن نشین رہنی چاہیے کہ آدمی کو جس جس سلسلے کی اجازت وخلافت ملتی ہے، ہر اس سلسلے کے مشائخ سے

محبت وعقیدت لازم وضروری ہے۔اگر ذرہ برابر بھی کسی شیخ سے نفرت ہوئی تو اس سلسلے کے فیوض وبرکات سے محروم ہو جائے گا۔ وہ کون حرماں نصیب ہوگا کہ رحمت وانوار کے بہتے ہوئے دھارے کو اپنی سمت آنے سے روک دے؟

اجمیر شریف میں اعلیٰ حضرت:

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کا مقدس سینہ فیضان اولیا کا دریا تھا، تمام سلاسل کے فیوض وبرکات کی نہریں آپ کے سینے میں آکر گرتی تھیں۔ آپ کے پیرومرشد سرکار آل رسول احمدی مارہروی رحمۃ اللہ علیہ نے جتنے سلاسل کی اجازت وخلافت عطا فرمائی تھی، ہر سلسلے میں آپ مرید فرماتے اور حسب ضرورت خلافت واجازت عطا فرماتے۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں آپ بغرض شرکت عرس اجمیر مقدس تشریف لے گئے تو حضرت علامہ غلام علی محدث اجمیری آپ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے اور آپ نے انھیں سلسلہ چشتیہ میں داخل فرمایا اور سلسلہ چشتیہ ہی کی اجازت وخلافت کی سند سے نوازا۔

شیطانی وسوسہ:

اخیر بات یہ کہ یہاں اس بات کا اعتراف تقریباً سب کو ہے کہ اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ تمام بزرگوں سے محبت کرتے تھے۔ ان کی عظمت شان اور رفعت مقام کے معترف تھے، لیکن سرکار غوث اعظم سے جو عشق تھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ غوث اعظم کو تمام اولیا کا سردار مانتے اور ہر سلسلے میں آپ کے فیوض وبرکات کو جاری وساری تسلیم کرتے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف ہر سلسلہ کے بزرگان سلف وخلف کو ہے۔ کیا دنیائے ولایت میں کوئی ایک بھی بزرگ وولی ملے گا جو غوث اعظم سے محبت نہ کرتا ہو؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان سے عشق نہ کیا جائے۔ ان کی محبت کا دم نہ بھرا جائے۔ ان کی شان میں منقبت کے اشعار نہ لکھے جائیں۔ اس کے باوجود اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے موقع بموقع دیگر بزرگان دین کے ذکر جمیل سے بھی اپنے قرطاس وقلم کو مشرف کیا ہے۔ ذیل میں اعلیٰ حضرت کے وہ اشعار پیش کیے جارہے ہیں جن میں بصراحت غریب نواز رضی اللہ عنہ کا ذکر حسنہ موجود ہے۔

بہر پایت خواجہ ہنداں شہِ کیواں جناب
بل علی عینی ورأسی گویدآں خاقاں توئی

کیا اس شعر میں غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے ذکر کے ساتھ سرکار غریب نواز رضی اللہ عنہ کا تذکرہ حسنہ نہیں ہے؟

عراق واجمیر:

سرکار غوث اعظم رضی اللہ عنہ کا فیض ہر سلسلہ میں آیا اور ہر شیخ آپ کے برکات سے مستفیض ہوا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ سلسلہ عالیہ چشتیہ میں بھی سرکار غوث اعظم کا فیض جاری وساری ہے۔ مولانا جمال الدین سہروردی سیر العارفین میں فرماتے ہیں:

”حضرت خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ عنہ اور حضور پرنور سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی تو حضرت خواجہ معین الدین چشتی حضرت کی خدمت اقدس میں ستاون یوم دن رات رہے۔ اور آپ کے فیوضات اور تصفیہ باطن وکمال سے مستفیض ہوئے۔“

(تفریح الخاطر صفحہ ۲۰)

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے اس کی ترجمانی یوں کی ہے۔

مزرع چشت بخارا وعراق واجمیر
کون سی کشت پہ برسا نہیں جھالا تیرا

ایک جگہ یوں گویا ہیں۔

یہ چشتی سہروردی، نقشبندی
ہر اک تیری طرف مائل ہے یا غوث
بخارا وعراق وچشت اجمیر
تری لو شمع ہر محفل ہے یا غوث

کیا ان دونوں اشعار میں سرکار غریب نواز کی ارفع واعلیٰ ذات کا ذکر نہیں ہے؟

□□□

حضور حجۃ الاسلام کی نعتیہ شاعری: ایک مطالعہ

مولانا محمد قمر الزماں مصباحی:
ڈائریکٹر ادارہ لوح وقلم سعد پورہ، مظفر پور، بہار

رضا اور خاندان امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اپنی خدمات دینیہ ،تحریر وتقریر،درس وتدریس ، ارشادوتبلیغ، سلوک وتصوف ،تصنیف وتالیف،فقہ وافتاء،عشق وعرفان اور زہد وتقوی کے حوالے سے پورے عالم اسلام میں ممتاز ومفتخر ہے۔ وہیں اس خانوادے نے اپنے نثری شہ پارے اورشعروسخن کے ذریعے بھی دنیا ادب کو وقار بخشا ہے۔حسان الہند امام احمد رضا قادری قدس سرہ نے فن نعت کو جو بلندی عطا کی ہے وہ تاریخ کا ایک زریں باب ہے اور یہ بھی بڑی سعادت کی بات ہے کہ آپ کی چار نسلیں عبادت سمجھ کر گیسوئے نعت کی مشاطگی میں مصروف ہیں ،خدا کرے فن کی یہ برکتیں قیامت کی صبح تک ان کی نسلوں میں منتقل ہوتی رہیں۔

شیخ الاسلام حجۃ الاسلام حضرت مولانا الشاہ مفتی محمد حامد رضا قادری علیہ الرحمہ 1875ء/1943ء اسی خانوادے کی علمی،ادبی،فقہی اور ایک عبقری ذات ہے جن کے فرق اقدس پر" الولدسرلابیہ" کا تاج عظمت پوری طرح چمک رہا ہے ۔ میرے اس جملے کی تائید خود اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ کے فرمان " انا من حامد وحامد منی" سے ہوتی ہے جسے تحدیث نعمت کے طور پر حضور حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ نے اپنے اس شعر میں استعمال کیا ہے ؎

انا من حامد وحامد رضا منی کے جلووں سے
بحمد اللہ رضا حامد ہیں اور حامد رضا تم ہو

آپ نے اپنی پوری تعلیم اپنے والد گرامی مجدد وقت اعلیٰ حضرت امام اہلسنت امام احمد رضا قادری قدس سرہ سے مکمل کی ،کبھی دوسرے مدرسہ کا رخ نہیں کیا مگر اپنی علمی جلالت ، جودت طبع ،فکری جولانیت ،تدریسی بصیرت ،فقہی مہارت اور جملہ علوم وفنون پر ملکہ کے اعتبار سے اپنے زمانے کے علماء پر فائق تھے۔عربی زبان وادب پر اس درجہ دسترس حاصل تھا کہ پوری جماعت اہلسنت آپ کی عربی دانی پر فخر محسوس کرتی تھی۔ دیگر علوم کی طرح نعت گوئی کی دولت فراواں بھی اپنے والد گرامی سے ورثے میں پائی تھی مگر افسوس کا مقام ہے کہ وہ سارا شعری اثاثہ حوادثات زمانہ کی نذر ہوگیا،خدا بھلا کرے حضرت مفتی ڈاکٹر امجد رضا امجد چیف قاضی ادارہ شرعیہ پٹنہ بہار اور مخلص گرامی محترم الحاج شاکر رضا نوری صاحبان کا جن کی کاوشوں سے چالیس صفحات پر مشتمل " تحائف بخشش" کے نام سے ایک کتابچہ شائع ہوا، جہاں جہاں سے انہیں کلام حاصل ہوئے جمع کرتے رہے چند اوراق پر مشتمل یہ مجموعہ اپنے حسن تخیل،طرز ادا،رعنائی فکر،بندش الفاظ ،سحر طرازی،زبان وبیان کی دلکشی اور گیرائی وگہرائی کے اعتبار سے کئی دیوان پر بھاری ہے۔کلام کے ہر شعر سے عشقِ رسول کی سوزش ٹپک رہی ہے ۔کہیں یاد حضور کی لذتیں،کہیں شہر طیبہ کی حسین شام کی لطافتیں،کہیں شہر نور کی صبح مسرت کا ذکر جمیل،کہیں عشقِ مصطفیٰ کی چاندنی،کہیں دیار رسول کے باد صبا کی سرمستی ،کہیں گریہ باطنی کا درد والم،کہیں شہر مدینہ کی جدائی کا غم ،کہیں محبت مصطفیٰ کے دل آویز نغموں کی صدائے دلنواز اور کہیں صحرائے مدینہ کے خار کی نازکی الغرض آپ کا پورا کلام جمالیاتی کیف وسرور،صوتی حسن اور عشقِ حقیقی کی خوشبوؤں سے معطر ہے۔آپ نے اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر چل کر نعت نگاری کو ایک نئی راہ عطا کی اور روایتی خول سے نکل کر شاعری کو نئے نئے رجحانات ،روشن امکانات اور پاکیزہ تخیلات بخشے۔آپ کے اشعار عشقِ رسول کا مکمل آئینہ دار ہیں آپ کے کلام کے ہر شعر سے عشق و محبت کی ایسی پاکیزہ شراب چھلکتی دکھائی دے رہی ہے جسے پینے کے بعد ایک عجیب قسم کا لطف ملتا ہے اور آپ کی شعری ریاضت وممارست برگ گل سے ہیرے کا جگر تراشنے کا ایک خوبصورت ہنر رکھتی ہے۔

آپ نے جس عہد میں نعت نگاری کے ایوان میں قدم رکھا اس وقت حضرت

سید کفایت علی کافی مرادآبادی، آپ کے والدگرامی حضرت رضا بریلوی، عم گرامی استاذ زمن حضرت حسن بریلوی، حضرت شفیق جون پوری اور حضرت جمیل بریلوی جیسے شعراء اسلام افق نعت پر کہکشاں کی مانند جگمگا رہے تھے، اس بھیڑ میں اپنی ایک جداگانہ شناخت قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر آپ نے نرالہ بار فکروں سے بالکل ہٹ کر اپنے نعتیہ گلشن میں جو تازہ پھول کھلائے اور نقش کہن کی فرسودہ چادروں میں لپیٹ ہوئے خیالات سے الگ تھلگ ہو کر نئی نئی فکروں کی جو تازہ بہار پیش کی ہے اسے معاصرین بھی رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

"تحائف بخشش" میں صرف دس کلام شامل ہیں مگر جدت تراکیب، حسین استعارے، شوکت الفاظ، زبان و بیان کی لطافت، پیرایۂ اظہار اور لب ولہجہ کی نزاکت دیکھ کر فن پر قدرت ومہارت اور ان کی شعری بصیرتوں کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ آپ بھی ان کے حسین استعارے، سحر آفرینی، لفظیاتی رنگ وآہنگ اور جمالیاتی ذوق کے خوبصورت چراغوں سے حریم فکر کے بام ودر کو روشن وتابناک کیجئے۔ دیکھئے طائران چمن، نغمہ وبلبل، غنچۂ آرزو، روئے صبیح، پھول سے گال، صبح دم، عارض نور بار، گردش چشم مست، جبین نور، بازی زیست، شاہد گل، حجلۂ نو بہار، بارش غم، وحشت عشق، تابش رخ، حسن ازل، برق شرربار، کعبہ ابرو، روح شمیم، شوق ناشکیبائی، آتش گل اور حسن ازل کی لن ترانیاں جیسے تراکیب کی جدت وندرت شاید کہیں دوسری جگہ دیکھنے کو ملے۔ اگر آپ کے سارے کلام زمانے کے دست برد سے محفوظ ہو گئے ہوتے تو نعتیہ شعروادب کا دامن اس طرح کے الفاظ ومعانی کے ذخائر سے اور بھی مالا مال ہوتا اور نعت نگاری کے باب میں ایک کامیاب اضافہ بھی۔

یہ مختصر سا مجموعہ دو حمد سے سے شروع ہے ایک حمد کی سرخی ہے" حمد باری تعالیٰ" اس کے چار اشعار ملاحظہ کریں

کثرت میں ہے کیسی وحدت، وحدت میں پھر کیسی کثرت
چشم مست میں تیری رنگت، پھولوں میں تیری خوشبو
لا الہ الا ھو لا الہ الا ھو یا من لیس الا ھو

روح میں تو ہے دل میں تو، میری آب و گل میں تو
اصل میں تو ہے ظل میں تو حق حق حق ھوھوھو
لا الہ الا ھو لا الہ الا ھو یا من لیس الا ھو

اول تو ہے آخر تو، باطن تو ہے ظاہر تو
قادر قادر تو، اللہ اللہ
لا الہ الا ھو لا الہ الا ھو یا من لیس الا

تحریر ہے آب زر سے ورق، دل میں لکھا حامد کے سبق
انت الہادی انت الحق، لیس الہادی الا ھو
لا الہ الا ھو لا الہ الا ھو یا من لیس الا ھو

اور دوسری حمد کا عنوان" نغمہ توحید" ہے اس کے بھی تین بند ملاحظہ فرمائیں۔

شاہدان چمن نے لب آب جو
آب گل سے نہا کر کے تازہ وضو
حلقۂ ذکر گل کے کیا روبرو
اور لگانے لگے دم بدم ضرب ہو
اللہ اللہ اللہ اللہ

یا الٰہی دکھا ہم کو وہ دن بھی تو
آب زمزم سے کر کے حرم میں وضو
باادب شوق سے بیٹھ کے قبلہ رو
مل کے ہم سب کہیں یک زباں ہوبہو
اللہ اللہ اللہ اللہ

میں نے مانا کہ حامد گنہگار ہے
معصیت کیش ہے اور خطا کار ہے
میرے مولی مگر تو تو غفار ہے
کہتی رحمت ہے مجرم سے لا تقنطو
اللہ اللہ اللہ اللہ

دیکھئے دونوں حمد پاک اپنے دامن میں کس طرح توحید کی عظمت، اس کی رفعت، لاشریک خدا ہونے کا اقرا اور اس کے تقدیسی وقار کو سنبھالے ہوئے ہے۔ آپ نے اس قدر مشکل زمینوں پر حمد یہ کلام کہے ہیں مگر فن کی مسکراتی کلیوں کا دیدہ زیب وپرکشش لباس کہیں سے سرکتا نظر نہیں آتا بلکہ تخیل کی دلکشی، فن کا ادراک، طرز ادا کی شوخی شعری تجربات، بلیغ استعارہ اور لفظوں کی بندش ہر مصرع میں اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ آپ حمد یہ اشعار پڑھتے چلے جائیں آپ کو ایک نئی قسم کی لذت، نیا سرور، نئ حلاوت اور اس کی وحدانیت کے پرکیف نظارے دیکھنے کو ملیں گے۔

اب آیئے ان کی نعتوں سے بھی چند اشعار آپ کے مطالعہ کے دسترخوان پر سجاؤں جس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ جس طرح آپ کی نور بار شخصیت مذہبی دنیا میں ایک معتبر حوالہ کے

طور پر جانی پہچانی جاتی ہے اسی طرح آپ کی متاع سخن بھی پورے ادبی افق پر فنکارانہ تمکنت کے ساتھ جلوہ گر ہے لکھتے ہیں۔

گناہگاروں کا روز محشر شفیع خیرالانام ہوگا
دلہن شفاعت بنی گی دولہانبی علیہ السلام ہوگ

ادھر وہ گرتوں کو تھام لیں گے ادھر وہ پیاسوں کو جام دیں گے
صراط ومیزان وحوض کوثر یہیں وہ عالی مقام ہوگا

خدا کی مرضی ہے ان کی مرضی، ہے ان کی مرضی خدا کی مرضی
انہیں کی مرضی پہ ہورہا ہے انہیں کی مرضی سے کام ہوگا

حضور روضہ ہوا جو حاضر تو اپنی سج دھج یہ ہوگی حامد
خمیدہ سر، آنکھ بند، لب پہ مرے درودوسلام ہوگا

یہ پوری نعت میدان محشر کا ہولناک منظر پیش کررہی ہے جہاں کوئی کسی کو پوچھنے والا نہیں، جہاں یاس ہی یاس ہے، کہیں سے امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں پڑ رہی ہے۔ وہیں آقائے کونین، شفیع محشر، رحمت عالم نور مجسم محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی کرم نوازیاں، ان کی رحمت پاش ادائیں اور ان کی عطا وبخشش امت عاصی کو قدم قدم پر سہارا دے رہی ہے اور پورے میدان حشر میں آپ ہی کی ذات گرامی یاس میں آس بن کر عصیاں شعاروں کو گلے لگا رہی ہے۔ ایک دوسری نعت کے بھی چند اشعار ملاحظہ کریں۔

چاند سے ان کے چہرے پہ گیسوئے مشک فام دو
دن ہے کھلا ہوا مگر وقت سحر ہے شام دو

روئے صبیح اک سحر زلف دوتا ہے شام دو
پھول سے گال صبح دم مہر ہیں لالہ فام دو

عارض نور بار سے بکھری ہوئی ہٹی جو زلف
ایک اندھیری رات میں نکلے مہ تمام دو

ان کی جبین نور پہ زلف سیہ بکھر گئ
جمع ہیں ایک وقت میں ضدیں صباح وشام دو

پی کے پلا کے میکشو! مجھ کو بچی کھچی ہی دو
قطرہ دوقطرہ ہی سہی کچھ تو برائے نام دو

ایک نگاہ ناز پہ سینکڑوں جام مے نثار
گردش چشم مست سے ہم نے پیئے ہیں جام دو

گاہ وہ آفتاب ہیں گاہ وہ ماہتاب ہیں
جمع ہیں ان کے گالوں پہ مہرومہ تمام دو

اب تو مدینہ لے بلا گنبد سبز دے دکھا
حامد و مصطفیٰ ترے ہند میں غلام دو

یہ کلام اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہے جس سے ان کی قادر الکلامی، جدید اسلوب، خوبصورت الفاظ کی ترتیب اور محبت رسول کی صداقت کے ساتھ ہر شعر سے نوائے عشق رسالت کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری کے مطالعہ کے بعد بڑے سے بڑے سخنور کو یہ اعتراف کرنا ہی ہوگا کہ حسن بیان، ذہن وفکر اور زبان وقلم پر واقعی آپ کی بادشاہت ہے اور اس میں کوئی دورائے نہیں کہ آپ کی شاعری فنی اور ادبی ہر لحاظ سے ایک بلند پایہ شاعری ہے اور میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ان کے شعری مہ ومہر نے زبان وادب کو ایک ایسا نور بخشا ہے جس سے صدیوں تک ادب کے مسافر اکتساب فیض کرتے رہیں گے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلوب کا نیا پن، ہیئت کی وسعت، سادگی میں پرکاری، لفظوں کا حسین انتخاب اور پیکر تراشی ان کے اشعار کی اہم اجزاء ہیں جو ان کے اونچے اور اچھے سخنور ہونے کے لئے ایک بڑا تعارف ہے۔ سنگلاخ زمینوں سے گزرنے کے بعد بھی آپ کے فکر وفن کی قبا پوری طرح سلامت ہے یہ بڑے ہی کمال کی بات ہے۔ آپ نے اپنے کلام میں زبان وبیان کی سحر طرازی کے ساتھ جذبۂ عشق کی ایسی روح پھونک دی ہے کہ ہر پڑھنے والا اپنے آپ کو گنبد خضری کے قریب پاتا ہے اور اس نور والی جالیوں سے اپنے وجود کو منور ومجلی کرتا ہے۔ ایک اور نعت پاک جو بیالیس اشعار کو محتوی ہے اس کے بھی چند اشعار ملاحظہ کریں لکھتے ہیں

شاہد گل ہے مست ناز حجلۂ نو بہار میں
ناز وادا کے پھول ہیں پھولے گلے کے ہار میں

گائیں گھٹائیں جھوم کر عشق کے کوہسار میں
بارش غم ہے اشکبار گریۂ بے قرار میں

عشق نے چھوڑی پھُل جھڑی دل کی لگی بھڑک اٹھی
آتش گل کے پھول سے آگ لگی بہار میں

کعبۂ ابرو دیکھ کر سجدے جبیں میں مضطرب
دل کی تڑپ کو چین کیا، تاب کہاں قرار میں

شاہد گل ہے مصطفیٰ طیبہ چمن ہے جان فزاء
گلشن قدس ہے کھلا صحن حریم یار میں

ساری بہاروں کی دلہن ہے میرے پھول کا چمن
گلشن ناز کی پھبن طیبہ کی خار خار میں

تم ہو حبیب کبریا پیاری تمہاری ہر ادا
تم سا کوئی حسیں بھی ہے گلشنِ روزگار میں

ماہ تری رکاب میں نور ہے آفتاب میں
بو ہے تری گلاب میں رنگ ترا انار میں

غنچۂ دل مہک اٹھا روح شمیم زلف سے
موج نسیم تھی بسی گیسوئے مشک بار میں

شوق کی ناشکیبیاں سوز کی دلگدازیاں
وصل کی نامرادیاں عاشق دل فگار میں

ان کی کلی میں ہے چٹک ان کی ہے پھول میں مہک
ان کی صبا میں ہے سنک ان کی لہک بہار میں

آپ کی نعتیہ شاعری صرف محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، ان کے معجزات، ان کے اختیارات اور ان کے عشق وعقیدت کی داستان ہی نہیں بلکہ اس میں آبشار کے جھرنوں کی راگنی، بادصبا کی خنکی، کلیوں کا تبسم، پھولوں کی لطافت ونزاکت اور فنی جمالیات کے اجالے بھی ہیں گویا آپ کی شاعری ایک زندہ شاعری ہے جسے پڑھنے کے بعد قاری اپنے چمنستان عشق میں لطافت ہی لطافت اور خوشبو ہی خوشبو محسوس کرتا ہے۔

"ذریعۂ التجا" کے نام سے ایک طویل منقبت جو بیاسی اشعار پر مشتمل ہے یہ حضور اعلیٰ حضرت کے مرشد کامل خاتم الاکابر حضرت سیدنا الشاہ آل رسول احمدی محدث مارہروی قدس سرہما کی شان والا تبار میں تحریر ہے جس کی ردیف " آل رسول" ہے جس ردیف میں خود اعلیٰ حضرت امام اہلسنت امام احمد رضا قادری قدس سرہ نے اپنے مرشدِ کریم کی شان عظیم میں ایک نظم لکھی اسی قافیہ وردیف میں حضور حجتہ الاسلام علیہ الرحمہ نے بھی نظم تحریر فرمائی دونوں میں فرق یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے فارسی زبان میں لکھی اور آپ نے اُردو زبان میں، ان میں سے چند اشعار بطور ضیافت طبع قارئین کی خدمت میں پیش ہیں تا کہ آپ یہ محسوس کر سکیں کہ حضور حجتہ الاسلام علیہ الرحمہ کو بھی اپنے والدگرامی کی طرح ہر صنف سخن پر ملکہ تامہ حاصل تھا۔

حق میں مجھ کو گمائے آل رسول
مجھ کو حق سی ملائے آل رسول

میری آنکھوں میں آے آل رسول
میرے دل میں سمائے آل رسول

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

خوشا دلے کہ دہندش ولائے آل رسول

خوشا سرے کہ کنندش فدائے آل رسول
گناہِ بندہ بخش اے خدائے آل رسول
برائے آل رسول از برائے آل رسول

حضور حجتہ الاسلام فرماتے ہیں

سر سے قربان تجھ پہ آنکھوں سے
آنکھیں سرسے فدائے آل رسول

سوکھے دھانوں پہ بھی برس جائے
ابرِ جود وسخائے آل رسول

حضرت سیدنا خاتم الاکابر شاہ آل رسول احمدی قدس سرہ العزیز نے جب امام احمد رضا قادری کو اپنی غلامی میں قبول فرمالیا اور شرف بیعت سے مشرف فرما کر پیر ومرید ایک ساتھ حجرے سے باہر نکلے تو دیکھنے والی نگاہیں پریشان تھیں اور یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ کون شیخ ہے اور کون مرید، اس حسین جلوؤں کی عکاسی حضرت حجتہ الاسلام نے جس طرح شعر کی زبان میں کیا ہے یہ انہیں کا حصہ ہے ان اشعار کو آپ بھی پڑھیں اور روحانی کیف وسرور حاصل کریں۔

ان کی سیرت ہے سیرت نبوی
ان کی صورت ہے لقائے آل رسول

ان کے جلوؤں میں ان کے جلوے ہیں
ہر اداء سے ادائے آل رسول

آتے دیکھیں جو اعلیٰ حضرت کو
آنکھیں کہہ دیں یہ آے آل رسول

ہے بریلی میں آج مارہرہ
اعلیٰ حضرت ہیں جائے آل رسول

□□□

قاضی عبدالوحید فردوسی کی علمی خدمات

امام احمد رضا کے تناظر میں

ڈاکٹر سید شاہ مظفر الدین بلخی
سجادہ نشیں خانقاہ فردوسیہ بلخیہ فتوحہ پٹنہ

"۔۔۔قاضی عبدالوحید فردوسی نے مقررین کے خطابات کو جس طرح قلم بند کیا ہے خود وہ بھی اپنی جگہ حیرت انگیز ہے، جبکہ اس زمانے میں آج کی طرح تکنیکی وسائل نہ تھے، سارا انحصار انسان کے حافظے پر تھا انہوں نے تمام تقاریر کو 'خلاصہ تقریر'، ملخص یا تلخیص کا عنوان دے کر تحریر کیا، جو حاصل کلام کی صورت میں سامنے آیا اور قاضی عبدالوحید فردوسی کی طرز تحریر نے اس میں مزید جاذبیت پیدا کردی۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی تقریر بھی تلخیص ہونے کے باوجود تلخیص کے عنوان کے بغیر ہے۔ شاید تلخیص لکھنے میں سوئے ادب مانع ہو۔۔۔"

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی کی دینی علمی سائنسی اور ادبی خدمات ایک روشن حقیقت ہے دنیائے علم وفن معترف ہی نہیں حیرت زدہ ہے کہ ان کی جامعیت کو کس نگاہ سے دیکھا جائے۔ دنیا اس امتیازی خصوصیت سے خالی بھی نہیں، عظیم سے عظیم ہستیاں، اپنی جامعیت کے اعتبار سے نمایاں ہوئیں۔ دنیا ان کے علم وفضل کا دم بھرتی ہے کیا ادب کا شعبہ ہو اور کیا سائنس کا۔ ہر ایک اپنی ذاتی اور انفرادی نیرنگی کا بے مثال نمونہ ہے۔ کسی ایک کا بھی نام لیا جائے تو دوسرا اس انتخاب سے الگ نہیں۔ بے شمار ہستیاں ہیں جو ناقابل فراموش ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی ذات بھی انہی ہستیوں میں ایک ہے لیکن ان مختلف النوع اور متفاوت علوم میں ان کا امتیاز منفرد اور عجوبہ ہے۔ کم وبیش کوئی علم ایسا نہیں جس میں اعلیٰ حضرت نے خامہ فرسائی نہ کی ہو اور ان کے علم نے تحقیق اور فیض کے موتی نہ بکھیرے ہوں۔ جہاں ان کی کثرت تصانیف پر حیرت ہے وہاں اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ ان تصانیف کا تعلق علم کے مختلف اور متضاد شعبوں سے ہے۔ اکثر مصنفین کی جتنی تصانیف ہوسکتی ہیں اتنے علوم پر ان کی دسترس اور مہارت ہے اور اسی تعلق سے تصنیفات ونگارشات کی کثرت بھی۔ 50 سے زائد علوم وفنون پر ان کی مہارت مسلم الثبوت ہے، جن میں آپ نے قیمتی آرا اور نئی تحقیقات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے ان علوم کی ترسیل اور اس کی حق ادائیگی میں ایک علمی زبان اختیار کی جو ہر علم کی ترسیل وتفہیم میں ناگزیر ہے۔ ایسی زبان اصطلاحات کی گراں باری سے سہل عمومی اور رواجی نہیں ہوتی پھر ان اصطلاحات کی وضاحت میں اسلوب وبیان کا بھی فرق اور مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی اکثر کتابیں ایک خاص علمی زبان میں تحریر کی گئیں جو فہم الدرک اور عام قبولیت

کے لیے شرح وتوضیح کی متقاضی ہیں۔

قاضی عبدالوحید فردوسی نے اس تشنگی اور ضرورت کا احساس کیا۔ انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اعلیٰ حضرت کا علم جو ایک مخفی خزینہ ہے، دنیا اس کے ثمرات اور نتائج سے بے خبر ہے اسے بارآور بنا سکیں۔ اہل علم و دانش متوجہ ہوں اور تعبیر و تحقیق کی راہ کشادہ ہو۔ اعلیٰ حضرت کی علمی عظمت ان پر اس درجہ حاوی ہوئی کہ انہوں نے (اپنے قائم کردہ مدرسہ) ''مدرسہ حنفیہ'' کے نصاب میں ان جدید علوم کو بھی شامل کر لیا جن میں اعلیٰ حضرت کی اور تصنیف و تالیف ہیں۔ مدرسہ حنفیہ کے نصاب میں جہاں قرآن وحدیث صرف ونحو منطق فلسفہ تصوف فقہ اور علم کلام کو شامل کیا گیا وہی انہوں نے سیر و تاریخ ہندسہ واقلیدس، علم ہیئت وجغرافیہ اور طب جیسے جدید علوم کو بھی شامل نصاب کر لیا۔ بلکہ متعدد کتابیں خود اعلیٰ حضرت کی بھی نصاب میں داخل کیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی عبدالوحید اعلیٰ حضرت کے علمی شان و اختصاص کو روشناس کرانے میں نہایت سنجیدہ اور فکر مند تھے اور اس کی ترویج واشاعت میں وہ ایک زاویہ نگاہ بھی رکھتے تھے۔ ان کے افکار وخیالات اور علمی وعملی خدمات کی توسیع واشاعت میں قاضی عبدالوحید کی یہ سعی وخدمت بھی شامل ہے۔

قاضی عبدالوحید فردوسی خود ایک جید عالم دین تھے عربی و فارسی میں اچھی قدرت رکھتے تھے۔ فارسی شاعری مسجع ومرصع ہوتی۔ عربی کلام کے بھی نمونے ہیں۔ اعلیٰ مشرقی تعلیم کے ساتھ صحافی و مصنف تھے اردو نثر میں صاف، شستہ اور رواں اسلوب وبیان ہوتا۔ پٹنہ میں جب مشاہیر علماء کرام کا ایک تاریخ ساز جلسہ عام ہوا، جس کی روداد کو جب وہ قلم بند کرنے لگے، تو مقررین کے فلسفیانہ اور منطقیانہ بیان کو بھی انہوں نے اپنی زبان میں آسان بنا دیا۔ بہت سے علمی مسائل لائق فہم اور قابل توجہ بن گئے۔ بعض مقامات پر احساس ہوتا ہے کہ مقررین کے بیانات یا مدعائے خیال کو براہ راست تحریر کرنے میں شاید ابہام وتکلف ہوتا، وہ قاضی عبدالوحید فردوسی کے طرز بیان میں آسان بن گیا ہے۔ اس ہفت روزہ اجلاس کے انعقاد کا محور، خود اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی ذات تھی۔ وہ اس اجلاس میں بنفس نفیس خود موجود رہے، اس کی سرپرستی فرمائی مختلف مقامات پر نشاندہی بھی فرماتے رہے۔ پٹنہ کے اسی اجلاس میں انہیں متعدد القابات کے ساتھ ''مجدد'' کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

قاضی عبدالوحید فردوسی نے مقررین کے خطابات کو جس طرح قلم بند کیا ہے خود وہ بھی اپنی جگہ حیرت انگیز ہے، جبکہ اس زمانے میں آج کی طرح تکنیکی وسائل نہ تھے، سارا انحصار انسان کے حافظے پر تھا انہوں نے تمام تقاریر کو ''خلاصہ تقریر''، ملخص یا تلخیص کا عنوان دے کر تحریر کیا، جو حاصل کلام کی صورت میں سامنے آیا اور قاضی عبدالوحید فردوسی کی طرز تحریر نے اس میں مزید جاذبیت پیدا کر دی۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی تقریر بھی تلخیص ہونے کے باوجود تلخیص کے عنوان کے بغیر ہے۔ شاید تلخیص لکھنے میں سوئے ادب مانع ہو۔ جابجا ملفوظاتی اور فرموداتی الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ قاضی عبدالوحید فردوسی نے اسے اپنی زبان میں ہی تحریر کیا ہے تا کہ ہر ذہنی سطح تک عوام و خواص کے درمیان ان کے خیالات کی رسائی ہو سکے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ امام احمد رضا کے علمی قدر ومنزلت عام ہو۔ یہ فکر امام رضا سے ان کے والہانہ تعلق اور ان کی مرتبہ شناسی کا احساس دلاتی ہے امام احمد رضا کی یہ تقریر شاہکار و یادگار تھی۔ قاضی عبدالوحید فردوسی کے پیرایہ اظہار نے اس میں ایک اور بھی نیا رنگ پیدا کر دیا اور اس کی افادیت اور مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ بعد کو یہ تقریر، امام رضا کے مجموعۂ تقاریر کا ایک حصہ بنی اور کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ پھر اس تقریر کو باضابطہ علاحدہ شکل دی گئی جو ''بیان ہدایت نشان'' کے نام سے شائع ہوئی۔ ہندو پاک مختلف مطابع اور مکاتب نے اسے شائع کیا۔ مزید اشاعت میں ترتیب نو ہوئی اور تحقیق وتخریج میں ماخذ مراجع کو بھی شامل کیا گیا اس طرح متعدد اشاعتیں مختلف مکاتب

وادارے سے عمل میں آئیں۔ ساری اشاعتوں کی بنیاد اور اس کے سرخیل قاضی عبدالوحید فردوسی کی ہی ذات ہے، جنہوں نے امام رضا کی تقریر کو اپنے انداز سے قلم بند کر کے مقبول عام کیا۔

اس تقریر کی بہت سی جہتیں ہیں لیکن خصوصیت تقریر کا سارتانا بانا رسول اللہ ﷺ کی عظمت ومحبت اور اطاعت سے جا ملتا ہے۔ یہی پہلو ہر معاملہ اور ہر مسئلے میں غالب ہے سارے مسائل اور تقاضوں کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھا گیا ہے اس تقریر میں اعلی حضرت فرماتے ہیں کہ ایمان صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ومحبت کا نام ہے۔ گویا جملہ مباحث کے ساتھ یہ تقریر سیرت رسول کی ایک کتاب نظر آتی ہے۔ یہ تقریر اعلی حضرت امام احمد رضا کی زبان سے ہے تو قاضی عبدالوحید فردوسی کی تحریر طرز تحریر میں صفحہ قرطاس کی زینت۔

امام رضا کا علمی مقام محتاج تعارف وبیان نہیں۔ دین میں مبادیات سے فروعات تک جن جن امور کا انہوں نے تعین کیا اور اسے اپنا قرار واقعی مقام ومعیار دیا وہ دین شناسی کے لیے ان کی خدمات کا گرانمایہ حصہ ہے۔ مسائل کے حل میں اُسے پس انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے فکری اجتہاد اور فقیہانہ بصیرت کو وقت کی زبان اور اقتصادی اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

قاضی عبدالوحید فردوسی کی خدمات دراصل اسی کی شروعات تھی جو امام احمد رضا سے ان کی عقیدت ومحبت اور دین میں خلوص ووابستگی کا ثبوت دیتی ہے۔ قاضی عبدالوحید فردوسی وہ نام ہے جسے شارحین امام رضا کی صف میں شمار کیا جائے گا۔ اسی طرح امام احمد رضا کے سائنسی موضوعات پر تحریر کردہ تصنیفات کو بھی ممکن الفہم بنا کر پیش کرنے کی ضرورت ہے سائنس کے نوع بنوع شعبوں میں ان کی گراں قدر نگارشات ورطہ حیرت میں ڈالتی ہیں متعلقہ علم وفن کے ماہرین ہی اس کی تشریح وتوضیح اور تعبیر وتحقیق میں حصہ دار ہو سکتے ہیں۔

آثار وقرائن بتاتے ہیں کہ قاضی عبدالوحید فردوسی نے اسے بھی پیش نظر رکھا اور امام احمد رضا کے علم وفن کو وسعت دینے کی عملی تحریک بھی شروع کر دی تھی۔ انہوں نے ایک مطبع کا قیام عمل میں لایا۔ اس کا نام ''مطبع اعوان اہل سنت وجماعت'' تجویز کیا۔ انہیں زندگی کی زیادہ مہلت نہ مل سکی اور اپنے منصوبے اور کارگزاریوں میں اضافہ نہ کر سکے۔ صرف 37 سال کی مختصر عمر میں 21 اپریل 1908 کو وہ اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ اسی مقصد سے ایک ماہنامہ ''تحفہ حنفیہ'' 1898 میں جاری کیا۔ امام احمد رضا کے نعتیہ کلام کی اشاعت اسی ''تحفہ حنفیہ'' سے شروع ہوئی جو بعد میں ''حدائق بخشش'' کے نام سے شائع کی گئی۔ رسالہ ''تحفہ حنفیہ'' نے بھی چند سالہ مدت پائی اور قاضی عبدالوحید فردوسی کی وفات کے ساتھ ان کے سرپرستی سے محروم ہو کر چند ایک سال میں بند ہو گیا۔

قاضی عبدالوحید فردوسی نے نشر واشاعت اور ترسیل وابلاغ پر جتنی توجہ مرکوز کی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ امام احمد رضا کے علمی کاموں کو آگے بڑھانا چاہتے تھے، کیونکہ قاضی عبدالوحید فردوسی کی اشاعتی سرگرمیوں کی ساری بنیاد اور منبع و مرجع امام احمد رضا کی ہی ذات تھی۔

قاضی صاحب کے والد جناب قاضی عبدالحمید نے جب مزید حصول تعلیم کے لیے انہیں انگلینڈ بھیجنے کی کوشش کی تو انہوں نے امام احمد رضا سے دوری گوارا نہیں کی صاف انکار کرتے ہوئے ہندوستان میں ہی رہنا پسند کیا۔ علامہ سید ظفر الدین قادری کی طرح یہ بہار کی دوسری شخصیت تھی جنہوں نے امام احمد رضا کے علمی کاموں کو تجدیدی رنگ میں پیش کیا اسے دوررس، ہمہ جہت اور موثر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ امام رضا کے دقیقہ رس موضوعات کو عام فہم بنانے کی فکر کی۔ اگر قاضی عبدالوحید کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو امام احمد رضا کی ذات کے اور بھی گوشے سامنے آتے اور دنیائے علم وادب اور فلسفہ و سائنس ان پہلوؤں سے مزید فیضیاب ہوتی۔

□□□

امام احمد رضا کے ممتاز و محبوب خلیفہ

قاضی عبدالوحید فردوسی کے چند رفقائے کار

ڈاکٹر محمد امجد رضا امجد

علم عمل عشق اور عزم کے مجموعہ کا نام قاضی عبدالوحید فردوسی ہے ۔انہوں نے زندگی کی ۳۷/بہاریں دیکھیں۔شروع کے تقریبا ۱۵/سال بچپن اور دور طالب علمی کے نکال دیے جائیں تو خدمت دین کے لئے انہوں نے تقریبا ۲۲/سال کا زمانہ پایا۔ اسی مختصر عرصہ میں انہوں نے وہ کارنامے انجام دیئے جو تاریخ کا اہم حصہ بنے اور بعد موت بھی ان کی زندگی کا سامان بن گئے ۔

مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ تنہا آدمی بہت کچھ تو کرسکتا ہے مگر سب کچھ نہیں کرسکتا۔تاریخ عالم پہ نگاہ ڈالیں تو ہر انقلاب اور ہر فتح کے پیچھے کمانڈر کے ساتھ افواج، امیر کے ساتھ اقوام اور امام کے ساتھ مقتدیوں کی جماعت نظر آئے گی۔خود اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے ساتھ علم و فضل، ادب فقہ، تصوف وسیاست ہر فن کے ماہرین کی ایک پوری جماعت تھی ۔انہوں نے حالات کے تقاضے کے مطابق کام کرنے کے لئے کئی طرح کی جماعت بنائی تھی چنانچہ جماعت رضائے مصطفےٰ، مجلس علمائے اہل سنت، جماعت اہل انصار اسی دور کی تنظیمیں ہیں جو بریلی شریف میں بنائی گئیں اور اس کے ذریعہ سے ناقابل فراموش خدمتیں انجام دی گئیں۔قاضی صاحب علیہ الرحمہ نے بھی عظیم آباد میں حالات کے تقاضے کے مطابق کام کرنے کے لئے تنظیمیں بنائیں سرپرستوں کی جماعت بنائی ۔احباب کا جتھہ بنایا اور ایک مشن کے تحت اپنے کام میں لگ گئے ۔اکابر علما مشائخ میں انہیں جن بزرگوں کا سہارا ملا، ان میں :

- جناب حضور شاہ امین احمد فردوسی: صاحب سجادہ خانقاہ معظم بہار شریف
- حضرت مولانا سید شاہ عزیز الدین قمری: صاحب سجادہ خانقاہ منعمیہ میتن گھاٹ
- حضرت مولانا سید شاہ اکبر داناپوری: صاحب سجادہ خانقاہ ابوالعلائیہ داناپور
- حضرت مولانا سید شاہ غلام مظفر بلخی فردوسی: صاحب سجادہ خانقاہ بلخیہ فردوسیہ فتوحہ
- حضرت مولانا سید شاہ خواجہ امجد حسین نقشبندی: صاحب سجادہ خانقاہ بارگاہ عشق تکیہ شریف

خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔دیگر مکرم ومقتدر علما و معززین شہر میں حضرت علامہ سید سلیمان اشرف بہاری، حضرت مولانا عبدالقیوم بدایونی، حضرت مولانا حکیم ابو یوسف عظیم آبادی، حضرت مولانا ضیاء الدین پیلی بھتی، مولانا محمد حسین رمز حاجی پوری، محترم شاہ کمال لودی کٹرہ، منشی علی حسن عظیم آبادی، وغیرہ افراد تھے جو قاضی صاحب کے مشن کو رواں دواں رکھنے میں معاون کار تھے۔قاضی صاحب نے سب سے پہلی جو تنظیم بنائی، اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے انہوں نے جن لوگوں کا نام لیا ہے وہ ہمارے لئے اہمیت کے حامل ہیں۔یہ نہ ہوتے تو قاضی صاحب کا مشن کامیاب نہ ہوتا۔اس لئے قاضی صاحب کی خدمات کے تذکرہ میں انہیں یاد رکھنا اخلاقی تقاضے کے ساتھ ان کی خدمات کا اپنا حق بھی ہے۔

قاضی صاحب ''مجلس عالی حمایت سنت محمدی'' تنظیم کے قیام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اطبائے شریعت وحکمائے دین وملت نے اس علت سراپا کفر وبدعت کے استیصال کی فکر کی اور ''مجلس عالی حمایت سنت محمدی'' نامی حنفی دارالشفا قائم کرنے کا ارادہ کیا۔
>
> اللہ تعالی کو یہ پسند آیا کہ ۲۵/ماہ محرم ۱۳۱۵ھ کو بمکان باغ امیر کبیر جلیل القدر سید شاہ محمد کمال صاحب حنفی قادری فضل رحمانی سلمہ الواہب کے اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔حامی شرع مبین جناب مولانا حافظ فتح الدین صاحب دام مجدہ پیش امام مسجد

ومدرس، ناصر دین احمدی جناب مولانا مولوی امیر علی صاحب حنفی قادری مدرس اعلی نار بل اسکول پٹنہ، رئیس الحکما فخر الشعرا مروج سنن مولانا مولوی حکیم محمد یوسف حسن صاحب حنفی قادری دام مجدہم (حسب ترتیب) صدر، نائب صدر و مہتمم مجلس تجویز پائے اور یہ خادم اہل سنت عبدالوحید غلام صدیق حنفی الفردوسی نائب مہتمم مجلس بنایا گیا۔ حضرت نور العارفین وقطب الکاملین جناب مولانا سید شاہ محمد اکبر صاحب ابوالعلائی داناپوری مدظلہ رکن مجلس کی تحریک اور رئیس مقتدر عاشق سنت سید الانس والجان جناب میر امیر جان صاحب دام مجدہ کی تائید سے انعقاد مجلس جیسے اہم تجویز کے اجرا کی عملی کوشش شروع ہوئی۔

[تحفہ حنفیہ: جمادی الاولیٰ ۱۳۱۵ھ ص ۹ تا ۱۲]

ان میں قطب الکاملین جناب مولانا سید شاہ محمد اکبر صاحب ابوالعلائی داناپوری علیہ الرحمہ کے سوا مندرج ذیل تمام نام ہمارے لئے غیر معروف ہیں:

سید شاہ کمال حنفی قادری فضل رحمانی:

رئیس مقتدر عاشق سنت سید الانس والجان جناب میر امیر جان صاحب دام مجدہ

رئیس الحکما مروج سنن مولانا مولوی حکیم محمد یوسف حسن صاحب حنفی قادری دام مجدہم

حامی شرع مبین جناب مولانا حافظ فتح الدین صاحب دام مجدہ

ناصر دین احمدی جناب مولانا مولوی امیر علی صاحب حنفی قادری

حالانکہ اسی اقتباس سے معلوم ہوا کہ ندوہ کے رد کی پہلی اینٹ رکھنے والے یہی حضرات ہیں۔ گویا اس وقت عظیم آباد بلکہ بہار کی سنیت کا معیار یہ تھا کہ وہ فضل وکمال علمی کے ساتھ دینی تصلب میں اپنا ایک معیار رکھتے تھے۔ انہیں مداہنت اور صلح کلیت گوارا نہیں تھی اس لئے انہوں نے علماومشائخ کی مشترکہ تنظیم "مجلس عالی حمایت سنت محمدی" تشکیل دی۔ گزرتے ادوار کے ساتھ اسی عظیم آباد کی فضا اب ایسی ہوگئی ہے کہ لوگ تصلب کے بجائے صلح کلیت کے دلدادہ ہوگئے ہیں۔ اپنے صلح کلی ہونے کی تردید کے لئے صلح کل اور صلح کلی کے معنی گڈمڈ کرنے لگے ہیں، بلکہ سوقدم آگے بڑھ کر معاذ اللہ! خدائے وحدہ لاشریک کے رحم وکرم اور عفو ومغفرت کو صلح کا نام دے کر خدا کو صلح کلی کہنے لگے ہیں۔

ع ببیں تفاوت رہ از کجا تا بکجاست

قاضی صاحب کے رفقائے کار میں علامہ سید سلیمان اشرف قدس سرہ، حضرت مولانا عبدالقیوم بدایونی، حضرت مولانا ضیاء الدین پیلی بھیتی مدیر تحفہ حنفیہ پٹنہ کے احوال مختلف تذکروں میں پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ مگر حضرت سید شاہ کمال حنفی قادری فضل رحمانی اور رئیس الحکما مولانا ابو یوسف صاحب حنفی قادری اور مولانا شاہ محمد حسین رمز مہتمم مدرسہ۔۔۔۔۔ حاجی پوری کے احوال کہیں نہیں ملتے۔ اس لئے ذیل میں ان حضرات کے حوالہ سے اپنی بساط بھر چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

رئیس کبیر محترم سید شاہ کمال حنفی قادری فضل رحمانی:

سید شاہ کمال صاحب کے احوال بظاہر تو نہیں ملے، مگر سید بدرالدین احمد نے اپنی کتاب "حقیقت بھی کہانی بھی" کے صفحہ ۵۶۷ سے ۵۶۹ تک شاہ مبارک حسین مبارک ساکن لودی کٹرہ کے احوال لکھے ہیں اور ان کی اولاد میں شاہ کمال کا نام اور شعر وسخن کے حوالہ سے ان کا تذکرہ آیا ہے اس سے یہ لگتا ہے کہ شاید شاہ مبارک حسین مبارک جن کے مکان میں علما کے قیام، اور لودی کٹرہ میں شاندار مکان اور باغات کا ذکر ہے وہ شاہ کمال کے والد ہوں۔ میں حتمی بات تو نہیں کر سکتا مگر اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بعض حصہ یہ ہے:

شاہ مبارک حسین مبارک محلہ لودی کٹرہ میں عالیشان حویلی میں رہتے تھے نوکری پیشہ ملازمین کے لئے الگ مکانات تھے۔ وہ 1269ھ میں پیدا ہوئے اور عمر بھی کافی پائی گھر میں دولت کافی تھی جو چاہا داد عیش وعشرت بھی بڑھ چڑھ کر دی۔ پٹنہ کے کہلاتے تھے مگر دیہات میں بسنے والے اپنی برادری کے لوگ اور رشتہ داروں کا سولہ آنا خیال رکھتے تھے۔ ان کا مکان رشتہ داروں کے لیے ایک مہمان سرا تھا غریب بچوں کی تعلیم وتربیت کا بھی سامان فراہم تھا۔ جہاں نادار بچے مفت کھانا پاتے تھے۔ ان کے یہاں صرف رنگین صحبتیں نہ جمتی تھیں بلکہ علماء مشائخ سے بھی بڑی راہ و رسم تھی وہ بھی ان کے یہاں آتے رہتے اس طرح دنیاوی عیش وعشرت میں یہ دینی کاموں سے بھی غافل نہ رہتے۔ شاہ مبارک حسین مبارک شعر وسخن کے دلدادہ تھے۔ آئے دن ان کے یہاں مشاعرے ہوتے باہر سے جو باکمال شاعر آتے ان کی

بڑی آؤ بھگت کرتے۔ مبارک حسین مبارکؔ حضرت وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ حضرت وحیدؔ برابر پٹنہ آتے رہتے۔ پٹنہ میں ان کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ قائم تھا جب حضرت وحید پٹنہ آتے تو کافی دنوں تک رہتے۔ شاہ مبارک حسین بڑی عزت کے ساتھ ان کو اپنا مہمان بنا کر رکھتے شاہ مبارک حسین مبارک کا دیوان مرتب تو ہوا مگر چھپ نہ سکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صاحب لے اڑے اور دیوان اس طرح غائب ہوا کہ پھر نہ ملا۔ شاہ مبارک کا انتقال 1340 ہجری میں ہوا۔ ان کے صاحبزادے خان بہادر شاہ محمد کمال صاحب مرحوم بھی اچھے شاعر تھے مگر ان کے دیوان کا بھی یہی حشر ہوا کسی صاحب کے ہاتھ اس طرح چڑھا کہ پھر اس کا سراغ بھی نہ ملا

مجلس کے قیام، مدرسہ کے قیام کے لئے ہونے والے اجلاس اور مدرسہ کے افتتاحی پروگرام، ہر جگہ حضرت شاہ کمال کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ مجلس کے قیام کے حوالہ سے ایک اقتباس شروع میں گزارا۔ مدرسہ حنفیہ کے افتتاح کا منظر بیان کرتے ہوئے قاضی صاحب شاہ کمال صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

ماہ سرور ربیع الاول شریف میں تقریب افتتاح مدرسہ، بڑی شان وشوکت سے ہوئی۔ معززین شہر جمع ہوئے۔ خواجہ فخر الدین صاحب رئیس محلہ نے صدارتِ جلسہ افتتاحِ مدرسہ قبول کی مولوی سید سلیمان اشرف صاحب واعظ بہاری نے صاف طور پر "افضلیت علم واہل علم" بیان کی اور اہل سنت کو اس مدرسہ کی امداد پر ترغیب دے کر مبارک باد دی۔ معزز نوجوان سید شاہ محمد کمال صاحب رئیس اعظم وآنریری مجسٹریٹ پٹنہ نے اپنی علوہمتی سے بڑی اعانت فرمائی دیگر معززین کو اس کا شریک ومعاون بنایا۔

مدرسہ کی اعانت، بچوں کے کھانے کے نظم اور مدرسہ کو مستحکم رکھنے کے حوالہ سے قاضی صاحب ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

باعث افتتاح ہمارا لائق وسعید نوجوان، رئیس والاشان حامی دین متین، ماحی شرورندو بین ذوالمجد والمواہب جناب سید شاہ کمال صاحب رئیس اعظم پٹنہ وآنریری مجسٹریٹ کی علوہمتی وحمایت دینی ٹھہری۔ اس ناصر سنت والا مرتبت کو حق سبحانہ وتعالیٰ شانہ نے ایسی فراخ حوصلگی وجوش مذہبی عنایت فرمایا جو مغتنمات زمانہ سے شمار کیا جاتا ہے۔۔ مدرسہ کی بناڈالی، اس کے قیام کی صورت نکالی، طلبہ کے طعام کی بھی خبر لیتے اور ماہ بماہ اکیس روپے خوراک کے مرحمت فرماتے ہیں۔ یہ فقیر اپنے معزز نوجوان مربی مدرسہ کا تہِ دل سے شکر گزار اور درگاہ الٰہی میں اس امر کا خواستگار کہ رب العزت ہمت میں برکت توجہ دینی میں استقامت وزیادت عافیت دنیا وآخرت عنایت فرمائے آمین یارب العٰلمین

[دربارِ حق وہدایت ص ۱۲۲]

ان کی یہی عطاونوازش تھی کہ قاضی صاحب کے پردہ کرنے کے بعد جو قطعہ تاریخ حضرت مولانا شہود الحق صاحب نے لکھی انہوں نے شاہ کمال صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

کچھ اس کے مدرسہ وتحفہ کا جوذ کر آیا
تو لوگ کہنے لگے اب تو چلنا ہے دشوار
مگر یہ تھا اثر ورنگ نیت خالص
کہ مدرسے کا تو پرساں ہوا وہ نیک اطوار
جو حسن خلق سے مامور خوبیوں سے بھرا
رئیس اعظم پٹنہ ہے ایسا ہے زردار
ہے اسم پاک محمد کمال شاہ کے ساتھ
وہی تو اس کا ہوا ہے مربی وغم خوار
خدا نے اس کو نوازا ہے ہر طرح سے یہاں
شرافت اور سعادت سے بھی ہے عزت دار
یقین ہے کہ اسے دے وہ اس طرح رونق
کہ خشک خشت کے حق میں ہے جیسے ابر بہار
کہ علم دوست بھی ہے اور حامی اسلام
اور اپنے دین کا بھی ہے رفیق اور غم خوار
خدائے پاک ترقی دے عمر میں اس کی
بسر ہو شادی وعیش وخوشی میں لیل ونہار
شہودؔ قطعہ کو تم ذکر حق پہ ختم کرو
کہ سب کلام سے ہے خوب تر یہی گفتار

قاضی صاحب کے وصال ۱۳۲۶ھ کے بعد ۲۹ سال آپ باحیات رہے۔ مگر آپ کے ساتھ وہ مضبوط ٹیم جڑی نہیں رہ پائی جو قاضی صاحب نے اکٹھی کی تھی اس لئے وہ تنہا مدرسہ حنفیہ کا بار نہیں اٹھا پائے اور وہ بند ہو گیا۔ سن ۱۳۵۵ھ میں آپ انتقال کر گئے۔ جناب مولانا ابوالخیر رحمانی مدیر الپنچ پٹنہ نے کئی تاریخی قطعات کہے، چند یہ ہیں

شہر میں کہرام ہے خلق ہے ماتم کناں
ایک بڑے شخص کا آج ہوا ہے وصال
چارتھی ذیقعدہ کی پیر کا دن بے گماں
چار بجے شام کو ان کا ہوا انتقال
خیرؔ نے اس غم کا یہ سال مسیحی کہا
آہ اجل! حضرت شاہ کمال

۱۹۳۷ء

سدھارے خلد کو شاہ کمال دریادل
بپا ہے شہر میں ماتم ہر ایک ہے گریاں
رئیس وحاجی وصاحب دل وغریب نواز
فقیر دوست مخیر معزز دوراں
کہاں اب ایسے رؤسا ہیں اس زمانے میں
آہ رہا نہ دہر میں باقی کسی کا نام ونشاں
جو نکالی تو نکلا یہ خیر سال وفات
وصال شاہ محمد کمال خلد مکاں

[کلمات خیر: مولانا ابوالخیر رحمانی ص ۵۸۶]

حضرت مولانا محمد حسین رمزؔ حاجی پوری:

قاضی صاحب کے رفقائے کار میں ایک نمایاں نام حضرت مولانا محمد حسین رمزؔ حاجی پوری، کا آتا ہے۔ آپ کی ولادت ۱۲۷۱ھ کو جر ہوا (جروحا) حاجی پور میں ایک بزرگ خاندان شاہ محمد خلیل عرف بھیکا شاہ کے یہاں ہوئی۔ آپ کا خانوادہ حاجی پور ''ماموں بھانجہ'' مزار کا متولی رہا۔ تعلیم کے لیے حاجی پور سے پٹنہ تشریف لائے درگاہ شاہ ارزاں میں قیام رہا۔ خانقاہ مجیبیہ کے مولانا شاہ بدرالدین صاحب اور خانقاہ منعمیہ کے حضرت مولانا عزیز الدین قمری صاحب سے عالمیت وفضیلت کی تکمیل کی اور استاذ کی ہی تربیت کے سبب ندوہ کے مخالفین میں شامل ہوئے۔ حضرت قاضی سے آپ کی رشتہ داری بھی تھے اور آپ ان کی زمینداری کے منتظم بھی تھے اس لئے قیام بھی ان کے دولت کدہ پہ تھا اس طرح تحریک اصلاح ندوہ اور تحفہ حنفیہ کی اشاعت وطباعت میں آپ قاضی صاحب کے معین کار رہے۔ قاضی صاحب کی اصلاح ندوہ تحریک میں ان کی معاونت کے حوالہ سے حضرت مفتی محمود احمد رفاقتی نے لکھا ہے:

> قاضی عبدالوحید صاحب نے جب ۱۳۱۴ ھجری میں علماء بدایوں و بریلی وغیرہ کی اعانت سے مجلس ندوۃ العلماء کے مفاسد کی اصلاح کا جھنڈا بلند کیا، اس وقت حضرت شاہ صاحب اپنے استاذ حضرت مولانا شاہ عزیز الدین حسین منعمی ابوالعلائی کے ہمراہ اصلاح مفاسد ندوہ کی تحریک میں شامل ہوئے۔ اس طرح پٹنہ ہی کیا پورے ہندوستان میں ارکان ندوہ کا زور ٹوٹا، شاہ صاحب حمایت سنت میں غرق اور عشق رسول پاک میں فنا تھے، اس کا اظہار ان کی نعتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے ان کا کلام ماہنامہ تحفہ حنفیہ میں بھی چھپتا تھا، ان کا ایک دیوان نعت تھا، ان کی نعتیں ان کی زبان سے فاضل بریلوی نے بھی سنی اور تحسین فرمائی، پٹنہ میں فاضل بریلوی کی تشریف آوری کے دو موقعوں پر آپ نے ان کی تواضع ومدارت کی، آخر زندگانی میں مستقل جروحا شریف میں آگئے تھے، یہاں ہی ۱۳۴۳ ھجری/ ۱۹۲۴ء میں وصال ہوا۔

[پاکان امت۔ جلد ۳ ص ۵۰۸]

تحفہ حنفیہ میں آپ کی تحریریں بالخصوص آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا تھا۔ قاضی صاحب کے وصال پہ کہے گئے ان کے تاریخی قطعات اسی کتاب کے باب ''رحلت'' میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

رئیس الحکما حضرت مولانا شاہ ابو یوسف حنفی قادری:

حضرت مولانا ابو یوسف حنفی قادری، شہر عظیم آباد کے نامی گرامی عالم فاضل اور حکیم تھے۔ ندوہ کی مخالفت اور حق کی حمایت میں پیش پیش رہے۔ مختلف مدارس سے اکتساب فیض کیا۔ حضرت قاضی صاحب ان سے متاثر تھے اور آپ ان کے جذبہ دینی کے قدرداں تھے۔ مجلس کے قیام اور مدرسہ اہل سنت کی تحریک میں ان کا نام بار بار آیا ہے اور قاضی صاحب نے ان کا نام بڑے احترام سے لیا ہے۔ چنانچہ ماسبق کے ایک اقتباس میں قارئین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ قاضی صاحب نے ان کے نام سے پہلے ''رئیس الحکما فخر الشعرا مروج سنن'' کے القابات استعمال فرمائے ہیں۔

تحفہ حنفیہ کا پہلا شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۵ھ میں منظر عام پہ آیا۔ پانچ ماہ تک قاضی صاحب نے خود ہی اس کی ادارت فرمائی اور اس اہتمام وکمال مہارت سے رسالہ نکالا کہ علما، شعرا، مشائخ سب داد وتحسین دینے پہ مجبور ہو گئے، بلکہ قاضی صاحب کی زیارت کے مشتاق ہو گئے۔ جناب مولانا خلیل الرحمٰن پیلی بھیتی کے یہ اشعار دیکھیں اور قاضی کے رسالہ اور ان کی شان ادارت کا کمال ملاحظہ کریں ؎

کفر و بدعت کو کھونے والا
تحفہ پٹنہ سے یہ چھپا ہے
کفار میں پڑ گئی ہے ہلچل
مت پوچھو کہ دم نکل گیا ہے
اک آگ جگر میں لگ گئی ہے
اک حشر جہاں میں بپا ہے
تحریر جدا ہے سب سے اس کی
تقریر میں اور ہی مزا ہے
ہر حرف در یتیم اس کا
جو لفظ ہے وہ لعل بے بہا ہے
میں ہی نہیں اے وحید اکیلا
عالم ترے تحفہ پر فدا ہے

پانچ ماہ تک اسے نکالنے کے بعد قاضی صاحب نے اپنی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے رئیس الحکما حضرت مولانا حکیم ابو یوسف عظیم آبادی کو شوال المکرم ۱۳۱۵ھ سے تحفہ کا مدیر بنایا جیسا کہ اسی مذکورہ شمارہ کے ص:۶۸ پر ہے:

چھٹے مہینے یعنی شوال سے یہ پرچہ ان شاء اللہ العزیز زیر ادارت حضرت مولانا مولوی حکیم یوسف حسن صاحب حنفی قادری عظیم آبادی شائع ہوا کرے گا۔

حضرت حکیم صاحب نے غالباً دو سال ماہنامہ تحفہ حنفیہ کی ادارت فرمائی۔ اور قاضی صاحب نے تحفہ کو جس معیار تک پہنچایا تھا، اسے برقرار رکھتے ہوئے دو سالہ کامیاب صحافتی سفر طے کیا۔ دو سال کے بعد حالات کیا ہوئے کہ آپ کی جگہ دوسرے مدیر بحال ہوئے، بتانا مشکل ہے۔ مفتی ذوالفقار خاں نعیمی کی کتاب ''ماہنامہ تحفہ حنفیہ: تعارف اور اشاریہ'' میں حضرت حکیم صاحب کے مضامین کے حوالہ سے دو تین اشاریہ ہیں، ان میں ایک مضمون دیہات میں جمعہ کے حوالہ سے ہے مفتی صاحب نے لکھا ہے:

دیہات میں نماز جمعہ کے جواز پر ایک فتویٰ کے رد میں ۱۶ر صفحات پر مشتمل علمی، تحقیقی، تفصیلی تحریر ہے۔ ذوالقعدہ ذوالحجہ ۱۳۱۶ھ میں ص ۳۵ر سے ۵۰ر تک یہ تحریر شائع ہوئی ہے۔

[کتاب مذکور ص ۳۵۳]

۱۳۱۶ھ کے اعتبار سے یہ وہی سن ہے جس میں آپ تحفہ کے مدیر ہیں۔ مفتی ذوالفقار نعیمی صاحب کے بقول حضرت مولانا ضیاء الدین پیلی بھیتی صفر ۱۳۱۹ھ سے تحفہ حنفیہ کے مدیر ہوئے۔ محقق اہل سنت حضرت مفتی محمود احمد رفاقتی نے مولانا ضیاء الدین تلہری پیلی بھیتی کی تعلیم کی تکمیل کا سن ۱۳۰۵ھ لکھا ہے اور مدرسہ حنفیہ و مطبع حنفیہ کے کام سنبھالنے کا سن ۱۳۱۸ھ لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ کام انجام دینے کے بعد صفر ۱۳۱۹ھ میں انہیں تحفہ کا مدیر بنایا گیا ہو۔ بہر حال اس حوالہ سے حضرت مفتی صاحب کی تحریر یہ ہے:

مدرسہ کے اہتمام اور مطبع اور رسالہ کے اہتمام وانصرام کے لیے محدث سورتی صاحب نے بمشاہرہ دس روپے ماہوار حق الخذمت پر ۱۳۱۸ ہجری کو بھیجا، مقاصد کی ترویج وتکمیل کے لیے حضرت ضیاء الملۃ نے پوری جد وجہد کی، مدرسہ کا اہتمام مطبع کا انتظام، رسالہ کی طباعت واشاعت بیک وقت پابندی سے کرتے ہیں۔

[پاکان امت: جلد چہارم]

قاضی صاحب کے احباب ورفقا کے حوالہ سے لکھی گئی یہ تحریر ابتدائی نوعیت کی ہے۔ اس میں اضافہ اور ترمیم کی ضرورت سے انکار نہیں۔ میں یہ سوچ کر کہ قاضی صاحب کے رفقا کا ذکر نہ کرنا قاضی صاحب کی روح کو ایذا دینا ہوگا، کہ انہوں نے آخر انھیں کی مدد سے آخرت کی بہاریں حاصل کیں، علما کے دلوں میں جگہ بنائی اور اپنے پیارے حبیب اکرم ﷺ کے دین متین کی مخلصانہ خدمات انجام دیں۔

اللہ تعالیٰ قاضی صاحب اور ان کے جملہ رفقائے کار کی خدمتیں قبول فرمائے اور ان کے مرقد پہ اپنی رحمتوں کے پھول برسائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ التحیۃ والتسلیم۔

□□□

امام احمد رضا کے حاسدین کی خدمت میں

مولانا حماد رضا قادری: مہتمم جامعہ حضرت فاطمہ پٹنہ

ہندوستان کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔ یہاں سے علم ادب معرفت سائنس ہرفن کے ماہرین پیدا ہوئے ہیں۔ مذہبی دنیا کے نامور علماوعرفا سلاسل اربعہ قادریہ چشتیہ سہروردیہ نقشبندیہ کے اکابر صوفیہ بھی اس سرزمین میں خوب خوب پیدا ہوئے، جن کی خدمات کی خوشبو سے پورا ملک معطر ہے۔ عطائے رسول سیدنا خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ کو سلطان الہند کہا گیا اور اس لئے کہا گیا کہ اس کے پیچھے ان کی تبلیغ ورشد وہدایت سے لاکھوں انسانوں کے مسلمان ہونے کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ بعد کے بزرگوں نے اسی سلسلہ کو آگے بڑھا اور یوں لاکھوں سے کڑوروں انسان دولت ایمان سے مشرف ہوئے ۔ پھر اسی ملک میں اسلام کے خلاف بعض فتنوں نے جنم لیا جسے اپنے اپنے دور کے اولیا علما اور مجددین نے ختم کیا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ بھی انہیں علماوصوفیہ میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کا لمحہ لمحہ دین کی خدمت اور حفظ ناموس رسالت میں صرف کیا۔ دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کے استیصال کے لئے مجددانہ شان کے ساتھ عملی میدان میں آئے اور دین پر آئے گرد وغبار کو صاف کر کے پھر اس کا چہرہ صاف وشفاف کر دیا۔ یہ اعتراف عرب وعجم کے علماوشیوخ طریقت نے کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ صاحب نعمت محسود ہوتا ہے، اس سے حسد کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جہاں ان کے مقام ومرتبہ کے جاننے والے حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں وہیں بعض لوگ اپنی کم نگاہی اور کور باطنی سے ان کی عیب جوئی میں لگے رہتے ہیں۔ امام احمد

"۔۔۔۔ابھی پندار اخبار میں ایک مضمون "تو نے اسلام کو کیا کھیل سمجھ رکھا ہے" کے عنوان سے پڑھنے کو ملا۔ اس مضمون میں جس طرح اہل سنت وجماعت کے ساتھ گستاخانہ زبان استعمال کی گئی ہے وہ بیان سے باہر ہے، مگر اسی تناظر میں قارئین کا ذہن صاف کرنے کے لئے بعض مخلص احباب کے اصرار پر یہ مضمون میں بھی لکھ رہا ہوں۔ مضمون سے یہ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ بے چارے مضمون نگار کو دو چار باتوں کے علاوہ اور کچھ معلوم ہی نہیں ہے اور مضمون نگار ہی کیا، ان کی پوری برادری بدعت بدعت اور شرک شرک کہتے کہتے قبر تک پہنچ جاتی ہے، اس کے سوا کوئی کچھ اور کہنے کو تیار ہی نہیں ہوتے اور ہوں بھی کیسے کہ ان لوگوں نے پوری زندگی اس کے علاوہ کچھ اور پڑھا ہی نہیں، اور اس لئے نہیں پڑھا کہ پڑھانے والا خود ہی بدعت شرک، بدعت، علامہ ابن قیم، علامہ ابن تیمیہ، کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہیں۔۔۔۔۔۔"

رضا قدس سرہ بھی ان ہی صاحبان علم ومعرفت کے بطل عظیم ہیں جن کے ماننے والے، ان کی علمی، فنی، مذہبی، ملی خدمات کا اعتراف کرنے والے اور ان کی شان معرفت کا برملا اظہار کرنے والے پوری

دنیا میں پائے جاتے ہیں۔اس کے برخلاف کچھ لوگ ان سے حسد میں جل بھن کر خاک ہوجانے والے بھی مل جاتے ہیں۔انہیں صرف یہ غم ستاتا ہے کہ ان کی یاد میں سیمینار و کانفرنس کیوں ہوتے ہیں ،لاکھوں مدارس ان کے نام پر کیوں ہیں؟ان کا عرس کیوں منایا جاتا ہے؟ان کی خدمات پر کتابیں کیوں لکھی جاتی ہیں؟ان پر اب تک پوری دنیا کی یونیورسیٹی میں ۵۲ رسے زاید پی ایچ ڈی کیسے ہوگئی؟اب ان جلنے بھننے والوں کو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ جس سے راضی ہوتا ہے اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا فرما دیتا ہے۔اگر تمھارے گھر کے لوگوں کو بدعقیدگی کے سبب ہوتے اور ہوں بھی کیسے کہ ان لوگوں نے پوری زندگی اس کے علاوہ کچھ اور پڑھا ہی نہیں، اور اس لئے نہیں پڑھا کہ پڑھانے والا خود ہی بدعت شرک ، بدعت ، علامہ ابن قیم ،علامہ ابن تیمیہ ، کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ان کی پڑھائی شروع ہوتی ہے ابن قیم سے اور ختم ہوتی ہے ابن تیمیہ پہ۔پھر قبر پر جانا شرک ،توسل شرک، چادر چڑھانا شرک۔اس کے علاوہ انہیں کچھ اور علم آئے کہاں سے ۔ارے بھائی اگر کچھ پڑھے لکھے ہوتو اس کے آگے بڑھ کر بھی کوئی علمی سوال کروتا کہ معلوم ہو کہ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے مدرسہ میں۔

رہ گئی بات مراسم خانقاہ ومعمولات اہل سنت کی تو اس موضوع پر

”۔۔۔رہ گئی بات عرس کی ،تو بابو! عرس اللہ والوں کا ہوتا ہے اور کونوا مع الصادقین کی تلاوت کرنے والے، اللہ والوں سے محبت بھی کرتے ہیں اور ان کا عرس بھی مناتے ہیں۔اہل سنت و جماعت ہی میں اللہ والے ہوئے ہیں یہ جتنے مزارات ہیں، خانقاہیں، درگاہیں ہیں یہ سب اہل سنت و جماعت والے ہیں کوئی ۱۸۵۷ کے بعد پیدا ہونے والے فرقہ دیوبندی وہابی، قادیانی، عقیدہ کے نہیں ہیں۔اگر یہ سنی نہیں ہوتے تو بزرگ ہی نہیں ہوتے۔بزرگ ہیں تو سنی ہیں۔اور سنی ہیں تو بزرگ ہوں گے۔اور بزرگ ہوں گے تو عرس منایا جائے گا۔کہ عرس کی اپنی معنویت ہے جسے اہل دل اور اہل علم سمجھتے ہیں۔اب۔۔۔“

لوگوں نے ٹھکرا دیا ہے تو قصور تمہارا ہے۔اعلیٰ حضرت کا تمہاری محرومی سے کیا تعلق ہے؟

ابھی پندار اخبار میں ایک مضمون ”تو نے اسلام کو کیا کھیل سمجھ رکھا ہے“ کے عنوان سے پڑھنے کو ملا۔اس مضمون میں جس طرح اہل سنت و جماعت کے ساتھ گستاخانہ زبان استعمال کی گئی ہے وہ بیان سے باہر ہے، مگر اسی تناظر میں قارئین کا ذہن صاف کرنے کے لئے بعض مخلص احباب کے اصرار پر یہ مضمون میں بھی لکھ رہا ہوں ۔مضمون سے یہ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ بے چارے مضمون نگار کو دو چار باتوں کے علاوہ اور کچھ معلوم ہی نہیں ہے اور مضمون نگار ہی کیا، ان کی پوری برادری بدعت بدعت اور شرک شرک کہتے کہتے قبر تک پہنچ جاتی ہے، اس کے سوا کوئی کچھ اور کہنے کو تیار ہی نہیں درسگاہ سے لے کر خانقاہ تک کے علماومشائخ نے اتنی کتابیں لکھ دی ہیں تمہاری پوری جماعت اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔تم تو حافظ ہو، ان کتابوں کو پڑھ بھی نہیں پاؤ گے۔اپنے بڑوں سے کہو کہ جس اعلیٰ حضرت پہ تم نے مضمون نگار بننے کے شوق اور جگہ جگہ ان کے عرس منائے جانے پہ جل بھن کر یہ مغلظات لے کر پندار اخبار میں آئے ہو ان کی کتابیں بھی پڑھنے کی صلاحیت ہے؟ یہ چیلنج قبول ہے تو آؤ، کوئی تاریخ طے کرو، میں ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ”فتاویٰ رضویہ“ ہی سامنے رکھتا ہوں۔ذرا سے پڑھ کے دکھا دو، پھر تم اس لائق ہوگے کہ تم سے کوئی علمی بحث کی جائے۔

اگر اردو کے فیروز اللغات دیکھ کر لفظوں کا معنی سمجھنا چاہو گے تو کیا سمجھو گے پیارے؟ اعلیٰ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے تو ذرا یہ

بتاؤ کہ مولا کا معنی اور لفظ کس کے لئے ہے؟ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کے لئے انت مولانا آیا ہے، پھر تمہارے مولوی ''مولانا'' کیسے ہو گئے؟ مولانا کا معنیٰ تو ہوا ہمارے مولا۔ تمہارے بقول اللہ مولا، اور تمہارے مولوی بھی مولا؟ کبھی اس پر بھی تمہیں توبہ کی توفیق ہوئی؟

خطابات والقابات کے اپنے مخصوص معانی ہوتے ہیں، اور اس کا تعلق اس عہد سے ہوتا ہے، اس عہد کی شخصیات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ امام احمد رضا کے لئے اعلیٰ حضرت سے تمہیں کھجلی ہونے لگی۔ پڑھے لکھے ہوتے تو جانتے کہ ہر فرقہ والے نے اپنے اپنے پیشوا کو بڑے بڑے القابات دئے ہیں۔ ان میں ایک لقب ''اعلیٰ حضرت'' بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب یہ لقب امام احمد رضا قدس سرہ کے لئے ایسا مقبول ہو گیا ہے کہ ''اعلیٰ حضرت'' کہنے سے ذہن فوراً امام احمد رضا کی طرف جاتا ہے۔ اگر اعلیٰ حضرت کے لقب کے حوالہ سے مطالعہ میں وسعت چاہئے تو بتانا تمہاری تشفی کے لئے حوالہ کے ساتھ بتادوں گا کہ ہندوستان میں کتنوں کے لئے ''اعلیٰ حضرت'' لکھا گیا ہے اور کون اس کے مستحق ہیں اور کون نہیں ہیں۔

رہ گئی بات عرس کی، تو بابو! عرس اللہ والوں کا ہوتا ہے اور کونوا مع الصادقین کی تلاوت کرنے والے، اللہ والوں سے محبت بھی کرتے ہیں اور ان کا عرس بھی مناتے ہیں۔ اہل سنت وجماعت ہی میں اللہ والے ہوئے ہیں یہ جتنے مزارات ہیں، خانقاہیں، درگاہیں ہیں یہ سب اہل سنت وجماعت والے ہیں کوئی ۱۸۵۷ کے بعد پیدا ہونے والے فرقہ دیوبندی وہابی، قادیانی، عقیدہ کے نہیں ہیں۔ اگر یہ سنی نہیں ہوتے تو بزرگ ہی نہیں ہوتے۔ بزرگ ہیں تو سنی ہیں۔ اور سنی ہیں تو بزرگ ہوں گے۔ اور بزرگ ہوں گے تو عرس منایا جائے گا۔ کہ عرس کی اپنی معنویت ہے جسے اہل دل اور اہل علم سمجھتے ہیں۔ اب آپ فیصلہ کرلو کہ جس کے یہاں کوئی بزرگ ہی نہیں ہو وہ عرس کیا منائے گا؟ اب آپ اپنی اس محرومی پہ جتنا من چاہے سر پیٹ لو مجھے کیا پڑی ہے کہ منع کروں؟

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی شخصیت علم وفن اور ادب ومعرفت کے اعتبار سے بہت اونچی ہے۔ علمائے عرب وعجم نے ان کی عظمت کے قصیدے پڑھے ہیں، بڑے بڑے القابات سے یاد کیا ہے۔ ان سے اجازت وخلافت لی ہے اور بعضوں نے انہیں اجازت وخلافت دی ہے۔ بعضوں نے ان کی کتابوں پر تقاریظ لکھی ہیں اور کسی نے اپنی کتاب پر حاشیہ لکھوایا ہے۔ تفصیلات دیکھنی ہوتوں تو ''الدولۃ المکیہ، حسام الحرمین، فتاوی الحرمین، کفل الفقیہ الفاہم وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کرلیں عربی نہ آتی ہو تو ان کتابوں کی روشنی میں لکھے جانے والے مقالہ ''امام احمد رضا اور علمائے عرب'' پڑھ لو جو پروفیسر مسعود احمد مظہری کی ہے۔ حقیقت کھل جائے گی۔

آخر میں اتنا لکھ کر اپنی بات ختم کر رہا ہوں کہ شرک وبدعت کے ٹھیکیداری ہی اگر آپ نے لی ہے تو سعودی عرب میں سنیما گھر کھولنے کے خلاف بھی لکھیں۔ سعودی حکومت کی قمار بازی کی اجازت پر بھی لکھیں۔ سعودی شہزادہ کی اسرائیل دوستی کے خلاف بھی لکھیں، عورتوں کو کھلی چھوٹ دینے کے خلاف بھی لکھیں۔ مگر آپ نہیں لکھیں گے مجھے معلوم ہے، کیوں کہ آقا شرک وکفر اور حرام کاری کے دلدل میں بھی ڈوبا ہو تو، آقا آقا ہے نا، ناراض ہو جائے گا، پھر آمدنی بند ہو گی، گمراہیت پھیلانے کا کارخانہ بند ہو جائے گا اور جتنی آسائشیں میسر ہیں سب بند ہو جائیں گی۔ اگر یہ جھوٹ ہے تو بتائیں اس کے خلاف بھی کبھی ایکشن لیا ہے، آپ لوگوں نے۔ اب بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے، دورنگی چھوڑ کر یک رنگی ہو جائیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کو اہمیت دیں۔ یہ ابن قیم اور ابن تیمیہ تمہیں ادھورا آئینہ دکھاتے ہیں اعلیٰ حضرت کو پڑھیں اس آئینہ سے اسلام صاف نظر آئے گا۔

سب ان سے جلنے والوں کے گل ہو گئے چراغ
احمد رضا کی شمع فروزاں ہے آج بھی

□□□

شیخ العرب والعجم محبوب الٰہ

حضرت حاجی شاہ محمد امداد اللہ چشتی صابری قدس سرہٗ

وصال: ۱۳۱۷ھ ہجری

محقق اہل سنت حضرت مفتی محمد احمد رفاقتی علیہ الرحمہ

"۔۔۔۔۔حضرت حاجی صاحب واصل الی اللہ موصل واکمل عارف باللہ تھے۔ان کے حلقہ ارادت میں علماء بہت شامل ہوئے۔گنگوہ شریف کے مولوی رشید احمد اور نانوتہ کے مولوی محمد قاسم، تھانہ بھون کے مولانا اشرف علی بھی قدیم مریدین ومتوسلین میں تھے۔اوران پر عنایات بھی بے کراں تھیں، لیکن ان کے قلوب پر ان کا علم حجاب اکبر بن گیا اور یہ لوگ دعویٰ فدائیت وفنائیت کے باوجود مرشد پر معترض ہوئے۔ان کے اشغال وعقائد کو بدعت اور غلط کہا، لکھا، موقع آنے پر انحراف کے الفاظ وکمالات کہنے سے بھی باز نہ آئے۔حضرت کی طرف غلط باتوں کو منسوب کیا، ان کی تحریروں میں کمی وبیشی کی اور اس کا اقرار بھی کیا۔فیصلہ ہفت مسئلہ کو جلوادیا، اور ہزار ہا افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مسلک شاہ امداد اللہ کو غلط اور کھری کھری آج بھی دیوبند اور سہارنپور کے مریدوں کے حلقوں میں کہی جاتی ہے۔یہی وہ گام تھا جب حضرت حاجی صاحب کے مولانا شاہ عبدالسمیع بیدل میرٹھی کو تحریر فرمایا تھا کہ کب کسی کی بات سارے عالم نے مانی ہے، خاص خاص لوگوں نے مانی ہے۔۔۔۔۔"

حضرت حاجی صاحب تیرہویں صدی کے ان اکابر اسلام اور پاکان امت میں تھے، جن کے وجود مسعود کی برکتوں سے علم ومعرفت کی بزموں میں انوار مصطفائی کی جوت پھیلی، جن کی بزم معرفت میں قرب ووصول کے علماء واصفیا دور دور سے حاضر ہوتے۔بے حد متواضع اور خاکسار حلیم وکریم تھے فاروقی نسب تھے۔حضرت ممدوح کی ولادت بروز اتوار آٹھویں صفر ۱۲۳۳ ھجری کو نانوتہ میں ہوئی۔وطن میں حفظ قرآن پاک کے حفظ کے لئے بٹھائے گئے، مگر یہ ناتمام رہا۔مروجہ علوم کی تحصیل کی، دہلی کا سفر کیا۔شاہ نصیر الدین نقشبندی سے بیعت کی، مجاہدات میں لگ گئے، پھر اسی راہ پر چلتے چلتے حضرت میاں نور محمد علوی چشتی صابری جھنجھاوی کی خدمت میں پہنچے۔یہاں پہنچنے پر منزل پائی اور ایصال الی المطلوب کی منزل رفیع پر فائز ہوگئے۔حج وزیارت کا سفر کیا، بامراد وطن آئے، ولولہ عشق، دل عشق منزل میں التہاب پیدا کرتا رہا۔مشائخ سلسلہ اولیائے کبار کے آستانوں کی زیارتوں کے سفر پر نکل پڑے۔عنایتوں سے سرفراز ہوئے، چند دن وطن میں قیام فرمایا، ولولہ عشق ملتہب رہا۔

۱۲۷۶ ھجری میں سفروصول کیا۔ حج وزیارت کے حسنات و مبرات کے حصول کے بعد مکۃ المکرمہ میں اقامت کی، کچھ دنوں مقام صفا میں ٹھہرے، چند دنوں کے بعد محلہ حارۃ الباب میں جا کر مقیم ہوئے۔ کچھ ایام بے حد عسرت وتنگی کے گزرے مگر آپ متقدمین اولیاء کی طرح صابر رہے۔ پھر دنیا آپ کے قدموں میں آپڑی، لیکن حضرت مجاہدات شاقہ میں قلب وقالب کے ساتھ مشغول رہے اور آپ قلب وقالب کے علوم وانوار سے سرفراز ہوئے۔ ذکر کی مداومت تحیۂ عبودیت اور ہضم نفس، شریعت مطہرہ کی تعظیم، علوم وعلماء کے اکرام کی زندگی بسر کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے قلوب کو آپ کی طرف متوجہ فرمادیے۔ علماء کی جماعت آپ کی خدمت کی طرف متوجہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعلیم وتربیت میں برکت عطافرمائی۔ آپ کے تربیت یافتگان بہت ہوئے۔

حضرت محبوب الہ حاجی صاحب قدس سرہٗ کے یہاں مثنوی حضرت مولوی معنوی کا درس بطور سلوک وشغل جاری رہتا تھا۔ خواص اور بلند مرتبت علماء اعلام اس میں شرکت فرماتے تھے۔ حج وزیارت کی نیت وارادہ سے جانے والے حج کے بعد بھی مہینوں وہیں مولوی معنوی سے فیض یاب ہوتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا شاہ انواراللہ حیدرآبادی دوبار دودو تین تین برس حاضر رہے۔ حسنۂ زمن عالم تارک الدنیا، مولانا شاہ احمد حسن کانپوری ہر چند تین چار برس کے بعد حاضر ہوتے اور تین چار برس حاضر خدمت رہتے اور علامہ اجل، استاذ زمانہ آپ کے زبان فیض ترجمان سے حقائق سماعت فرماتے اور افادات کو جمع کرتے، حضرت کانپوری کے خصائل وفضائل میں ترک وتجرید غالب تھا مگر آپ نے دل وجان سے افادات امدادیہ کو مثنوی شریف کے ساتھ طبع کرایا، اتنی خوبصورت کتابت وطباعت تو ایران وافغانستان میں بھی ممکن نہ تھی۔

حضرت حاجی صاحب واصل الی اللہ موصل واکمل عارف باللہ تھے۔ ان کے حلقہ ارادت میں علماء بہت شامل ہوئے۔ گنگوہ شریف کے مولوی رشید احمد اور نانوتہ کے مولوی محمد قاسم، تھانہ بھون کے مولانا اشرف علی بھی قدیم مریدین ومتوسلین میں تھے۔ اور ان پر عنایات بھی بے کراں تھیں، لیکن ان کے قلوب پر ان کا علم حجاب اکبر بن گیا اور یہ لوگ دعویٰ فدائیت وفنائیت کے باوجود مرشد پر معترض ہوئے۔ ان کے اشغال وعقائد کو بدعت اور غلط کہا، لکھا، موقع آنے پر انحراف کے الفاظ وکمالات کہنے سے بھی باز نہ آئے۔ حضرت کی طرف غلط باتوں کو منسوب کیا، ان کی تحریروں میں کمی وبیشی کی اور اس کا اقرار بھی کیا۔ فیصلہ ہفت مسئلہ کو جلوادیا، اور ہزار ہا افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مسلک شاہ امداداللہ کو غلط اور کھری کھری آج بھی دیوبند اور سہارنپور کے مریدوں کے حلقوں میں کہی جاتی ہے۔ یہی وہ گام تھا جب حضرت حاجی صاحب کے مولانا شاہ عبدالسمیع بیدل میرٹھی کو تحریر فرمایا تھا کہ کب کسی کی بات سارے عالم نے مانی ہے، خاص خاص لوگوں نے مانی ہے۔

حضرت حاجی صاحب عالم قلب اور عارف رب تھے، حد درجہ متبع شریعت تھے، فتاویٰ دستخط جب فرماتے جب مکۃ المکرمہ کے علماء کبار عرفا پاک پروردگار شیخ الدلائل مولانا شاہ عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی تلمیذ اجل مسند الوقت شاہ عبد الغنی مجددی مہاجر مدنی اور پایہ حرمین مولانا محمد رحمت اللہ مکی جواب تحریر فرمادیتے۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا مسلک ہی میرا مسلک ہے۔ شاہ صاحب طریق متوسط پر چلتے تھے۔ میں بھی طریق متوسط پر چلتا ہوں۔ چودہویں ہجری کے اوائل میں محفل مولود اور نیاز وفاتحہ کے مبحث کے جواز میں حضرت مولانا شاہ عبدالسمیع بیدل نے انوار ساطع در بیان مولود وفاتحہ لکھ کر شائع فرمایا۔ حضرت حاجی صاحب مرشد برحق کی خدمت میں بھی ملاحظہ کے لئے روانہ فرمایا۔ آپ نے پڑھوا کر سنا، خوشنودی ظاہر فرمائی، لکھوا کر بھیج دیا کہ انوار ساطعہ فقیر کے مسلک ومشرب کے مطابق ہے اور دعا فرمائی کہ اس کو قبول عام حاصل ہوا۔ انوار ساطعہ کا جواب اور رد

مولانا رشید احمد گنگوہی نے براھین قاطع علی علام انوار ساطع کے نام سے لکھا۔ علمائے دیار وامصار نے انوار ساطع کی تائید کی۔ مؤلف انوار ساطع کی نصرت میں نصرت وتائیدی تقاریظ لکھے۔ حضرت حاجی صاحب نے تحریر فرمایا کہ فقیر کی دعا قبول ہوئی۔ علماء ومفاتی زمانہ اس کی نصرت میں کھڑے ہوگئے اور آتش فتنہ، براہین قاطعہ نے بھڑکائی۔ حضرت صاحب اپنی دعا قبولیت سے مسرور ہوئے، ادھر مولوی گنگوہی نے اپنے خواص کو تحریر کیا کہ ''انوار ساطعہ کی تائید کی وجہ سے حضرت صاحب کو یہ ثمرہ ملا کہ خواص منحرف ہوکر الگ ہوگئے۔ اہل علم باخبر ہیں، خاصہ خاصان کا دعویٰ مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب اور ان کی جماعت کو تھا، یہی وہ گام تھا جب مولوی گنگوہی صاحب نے نخوت فکر کی بلندیوں سے مرشد کو للکارا اور دھمکایا کہ:

''اگر آپ چاہیں تو سلسلۂ بیعت سے مجھے خارج کردیں۔''

حضرت حاجی صاحب کا مسلک ومشرب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا تھا، مولانا شاہ محمد مخصوص اللہ محدث نے مولانا محمد اسماعیل صاحب اور مولانا عبدالحیٔ صاحب سے جامع مسجد دہلی کے مناظرہ میں کہا تھا کہ تمہارے لوگ برملا کہتے ہیں کہ مسلک شاہ عبدالعزیز برائیوں اور خرابیوں کا مجموعہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز کی راہ جہنم کی راہ ہے،'' ادھر دیکھئے اور سنئے تو مولوی گنگوہی مولوی اشرف علی تھانوی سے صاف صاف کہہ رہے تھے کہ حضرت صاحب بدعت میں ملوث ہیں اور بدعتی کی تعظیم کب روا ہے؟ یہ خط کی عبارت کا حصہ ہے جسے عاشق علی میرٹھی نے مکاتیب رشیدیہ کے نام سے چھاپا تھا۔ اور تذکرۃ الرشید میں کہہ رہے ہیں کہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث بات لگا کر کہتے تھے۔

محبوب الٰہ حضرت حاجی شاہ امداداللہ قدس سرہٗ کے یہ ان مریدوں اور خواص کہلانے والے فقہاء عصر محدثین دہر کا حال احوال تھا۔ دوسری طرف خاصہ خاصان خاص کی وہ معظم جماعت تھی۔ وہ مقتدائے زمانہ گروہ تھا جس کے قلب وقالب پر پیر ومرشد کی جلالت شان عظمت مکان کے انوار وبرکات کی بارشیں ہورہی تھیں۔ اور وہ توفیق باللہ تعالیٰ سے موفق نیک باطن، پاک دل، پاک نہاد فیض یاب ہوتی تھی۔ اس پاک گروہ میں بہت ممتاز اور والہ وشیدا ذات گرامی امام اہل سنت استاذ زمن مولانا الحافظ حاجی شاہ احمد حسن صاحب قدس سرہٗ کانپوری کی تھی۔ حضرت امام اہل سنت قلب وقالب سے فدا اور مطیع ومنقاد تھے ان کے ممتاز ترین تلامیذ حضرت حاجی صاحب قبلہ کی ارادت اور خلافت سے سرفراز تھے، ان عالی مرتبت افراد میں فرد فرید

حضرت مولانا قاضی عبدالرزاق صاحب نگینوی کانپوری

حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب پنجابی کانپوری

حضرت مولانا شاہ محمد شفیع صاحب نگینوی مکی

حضرت مولانا شاہ محمد محب اللہ مہاجر مکی تھے۔

مولانا محمد شفیع صاحب ھجرت کرکے مکے جابسے تھے، اور حضرت حاجی صاحب کے وصال کے بعد اُن کے جانشین بنائے گئے تھے۔

حضرت اُستاذ زمن اور اُن کے اخلاف وتلامیذ کے فتاویٰ اور تحریرات موجود ومحفوظ ہیں، جن سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حلقۂ ارادت منداں، حضرت حاجی صاحب کے مسلک ومشرب پر ثابت قدم اور اس کے احقاق واثبات پر سرگرم اور گنگوہی وتھانوی مسلک کا شدت وغلظت سے رد کرنے والا تھا، حضرت اُستاذ زمن کے بااختصاص برادران طریقت حضرت مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی، حضرت مولانا شاہ عبدالسمیع بیدل میرٹھی، مولانا شاہ محمد افضل کابلی اکبر آبادی، مولانا شاہ قادر بخش سہسرامی حافظ الحدیث مولانا شاہ محمد سلیمان چشتی پھلواری، مولانا شاہ محمد بدرالدین قادری پھلواری، رشیدی کے شدومد سے رد اور بطلان کرنے والوں میں تھے۔

□□□

بڑے پیمانے پر مدارس، مساجد، خانقاہوں کی مسماری:

قانونی کارروائی یا وسیع تر سنگھی نظریاتی ایجنڈے کا حصہ

گزشتہ دو تین ماہ کی سیاسی و سماجی صورتحال کا تحقیقی جائزہ

احمد رضا صابری (ڈائریکٹر احمد پبلیکیشنز، پٹنہ)

''۔۔۔۔ چھ ماہ کی مختصر مدت میں تین سو سے زائد مساجد، مزارات اور درگاہیں بلڈوزر کارروائی کے ذریعے مسمار کی گئیں اور ان میں سے متعدد مقامات صدیوں سے قائم اور مقامی مذہبی و سماجی زندگی کا مرکز تھے۔ رپورٹ میں خاص طور پر دہرادون کی ایک تاریخی درگاہ کا ذکر کیا گیا جو وقف بورڈ میں باقاعدہ رجسٹرڈ ہونے کے باوجود رات کے وقت بغیر پیشگی نوٹس کے مسمار کر دی گئی، جس پر سپریم کورٹ کو مداخلت کرنا پڑی اور ریاستی حکومت کے خلاف توہینِ عدالت کا نوٹس جاری کیا گیا۔ اسی رپورٹ میں اتراکھنڈ کے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی تحلیل کو بھی مسلمانوں کی دینی خودمختاری پر حملہ قرار دیا گیا۔۔۔''

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا دعویٰ کرنے والا ملک بھارت گزشتہ کچھ عرصے سے اپنی سب سے بڑی مذہبی اقلیت، یعنی تقریباً تیس کروڑ مسلمانوں کے حوالے سے سنگین سوالات کی زد میں ہے۔ گزشتہ دو تین ماہ کے دوران ریاستی و مرکزی انتظامیہ، عدالتی کارروائیوں اور انتہا پسند ہندوتوادی تنظیموں کی سرگرمیوں نے یہ تاثر مزید گہرا کر دیا ہے کہ بھارتی مسلمانوں کو منظم انداز میں نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ مساجد، مدارس اور درگاہوں کا انہدام، وقف املاک پر قانونی شکنجہ، نفرت انگیز بیانات اور ہجومی تشدد کے واقعات نے ملک بھر کی مسلم آبادی میں شدید بے چینی اور خوف کی فضا پیدا کر دی ہے۔ اس تحریر میں حالیہ رپورٹس، عدالتی کارروائیوں اور میدانی واقعات کی روشنی میں اس صورتحال کا خلاصہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

بلڈوزر کارروائیاں: عبادت گاہوں اور دینی اداروں کا انہدام

گزشتہ چند ہفتوں میں بھارت کے مختلف صوبوں سے مساجد، مدارس اور درگاہوں کے انہدام کی خبریں مسلسل سامنے آتی رہی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق صرف پینتالیس دن کے دوران بھارت کی مختلف ریاستوں میں ایک ہزار سال پرانی مسجد سمیت تئیس مساجد، مدارس اور درگاہیں مسمار کی گئیں، جو اس رجحان کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔

اتر پردیش کے شہر غازی آباد میں انتظامیہ نے سرکاری زمین پر تجاوز کا الزام عائد کرتے ہوئے ایک مدرسے کو مسمار جبکہ دو دیگر مدارس کو بند کر دیا، حالانکہ مدرسے کی انتظامیہ کا مؤقف تھا کہ ادارہ برسوں سے باقاعدہ رجسٹرڈ ہے۔ اسی موقع پر ایک ہندو تنظیم کے عہدیدار نے ریاستی وزیراعلیٰ سے دارالعلوم دیوبند کے خلاف بھی بلڈوزر کارروائی کرنے کا مطالبہ کر دیا، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ مہم انفرادی واقعات تک محدود نہیں بلکہ ایک وسیع تر نظریاتی ایجنڈے کا حصہ سمجھی جا رہی ہے۔

بنارس کے تاریخی مسلم اکثریتی علاقے دالمنڈی میں سڑک کشادہ کرنے کے نام پر ایک صدیوں پرانی درگاہ سمیت چھ مساجد کو مسماری کے لیے نشان زد کیا گیا، جبکہ اس مہم میں پہلے ہی سو سے زائد گھر اور دکانیں گرائی جا چکی تھیں جن سے سینکڑوں افراد بے گھر ہوئے۔ مقامی رہائشیوں اور مذہبی اداروں کے ذمہ داران نے اس اقدام کو ترقیاتی منصوبے کی آڑ میں مسلمانوں کے مذہبی مقامات پر براہِ راست حملہ قرار دیا۔ اسی طرح اتر پردیش کے ضلع سنبھل میں بھی انتظامیہ نے قبرستان کی زمین پر مبینہ طور پر تعمیر کی گئی ایک عیدگاہ کے خلاف انہدامی کارروائی کی۔

اس رجحان کی سنگینی کا اندازہ ایسوسی ایشن فار پروٹیکشن آف سول رائٹس (اے پی سی آر) کی ایک تفصیلی فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ سے ہوتا ہے، جس کے مطابق چھ ماہ کی مختصر مدت میں تین سو سے زائد مساجد، مزارات اور درگاہیں بلڈوزر کارروائی کے ذریعے مسمار کی گئیں اور ان میں سے متعدد مقامات صدیوں سے قائم اور مقامی مذہبی و سماجی زندگی کا مرکز تھے۔ رپورٹ میں خاص طور پر دہرادون کی ایک تاریخی درگاہ کا ذکر کیا گیا جو وقف بورڈ میں باقاعدہ رجسٹرڈ ہونے کے باوجود رات کے وقت بغیر پیشگی نوٹس کے مسمار کر دی گئی، جس پر سپریم کورٹ کو مداخلت کرنا پڑی اور ریاستی حکومت کے خلاف توہینِ عدالت کا نوٹس جاری کیا گیا۔ اسی رپورٹ میں اتراکھنڈ کے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی تحلیل کو بھی مسلمانوں کی دینی خودمختاری پر حملہ قرار دیا گیا۔

لکھنؤ کے اکبر نگر علاقے میں بھی ترقیاتی منصوبے کے نام پر جاری انہدامی مہم کی زد میں کئی مساجد اور مدارس آئے، جن میں ایک وہ مدرسہ بھی شامل تھا جسے مقامی چندے سے پچیس برس قبل تعمیر کیا گیا تھا اور جس کے بانی نے اس کارروائی پر شدید مایوسی کا اظہار کیا۔ ان تمام واقعات میں ایک قدرِ مشترک نمایاں ہے: **قانونی، انتظامی یا ترقیاتی جواز کے پردے میں مسلمانوں کے مذہبی و تعلیمی اداروں کو نشانہ بنایا جانا، اور نوٹس یا مناسب قانونی کارروائی کے بغیر فوری انہدام۔**

وقف ترمیمی ایکٹ اور مسلم املاک پر ریاستی گرفت:

مسلمانوں کی وقف املاک سے متعلق قانون سازی بھی حالیہ عرصے میں شدید تنازع کا موضوع رہی ہے۔ ناقدین کے نزدیک وقف ترمیمی ایکٹ 2025 محض انتظامی اصلاحات کا نام نہیں بلکہ مسلم خیراتی اداروں پر گرفت مضبوط کرنے، ان کی خودمختاری کمزور کرنے اور مذہبی اثاثوں پر ریاستی کنٹرول بڑھانے کی ایک کوشش ہے۔ نئے قانون کے تحت اب کسی جائیداد کو وقف قرار دینے کے لیے صرف وہ شخص اہل ہے جو کم از کم پانچ برس سے باقاعدہ مسلمان کے طور پر مذہب پر عمل پیرا ہو اور جائیداد کا مالک بھی ہو، جبکہ برسوں کے مذہبی استعمال کی بنیاد پر وقف تسلیم کیے جانے کی سابقہ گنجائش ختم کر دی گئی ہے، جس سے متعدد غیر دستاویزی وقف املاک اپنی قانونی حیثیت سے محروم ہو سکتی ہیں۔

سپریم کورٹ نے اگرچہ مکمل قانون پر حکمِ امتناعی جاری کرنے سے انکار کیا، تاہم چیف جسٹس بی آر گوئی کی سربراہی میں بینچ نے قانون کی بعض متنازع دفعات پر عملدرآمد روک دیا، جن میں پانچ سالہ مذہبی عمل کی شرط اور کلکٹر کو وقف املاک کی حیثیت کا فیصلہ کرنے کا اختیار شامل تھا۔ دوسری جانب عدالت نے قبائلی علاقوں کی زمین کو وقف قرار دینے پر پابندی کی شق برقرار رکھی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر مذہبی و سماجی تنظیموں نے اس قانون کے خلاف ملک گیر احتجاجی مہم جاری رکھی ہوئی ہے اور اسے وقف املاک کو بتدریج ریاستی تحویل میں لینے کی راہ ہموار کرنے کی کوشش قرار دیا ہے۔ اسی دوران عبادت گاہوں کے تحفظ سے متعلق قانون 1991 کے نفاذ کی درخواستیں بھی سپریم کورٹ میں زیرِ التوا ہیں، جن کا مقصد تاریخی مساجد کو نشانہ بنانے کی نئی قانونی کوششوں کے خلاف تحفظ فراہم کرنا ہے۔

نفرت انگیز بیانات، ہجومی تشدد اور ریاستی خاموشی:

قانونی و انتظامی اقدامات کے متوازی سماجی سطح پر بھی مسلم مخالف جذبات کو ہوا دی جا رہی ہے۔ سنٹر فار اسٹڈی آف سوسائٹی اینڈ سیکولرازم کی تازہ مانیٹرنگ رپورٹ کے مطابق اگرچہ بڑے پیمانے کے فرقہ وارانہ فسادات میں کمی آئی ہے، تاہم ہجومی تشدد،

نفرت انگیز جرائم اور شناخت کی بنیاد پر کشیدگی بدستور برقرار ہے۔ رپورٹ کے مطابق ایک سال کے دوران ہجومی تشدد کے کم از کم چودہ واقعات رپورٹ ہوئے جن میں متعدد افراد ہلاک ہوئے، جبکہ مسلم اور عیسائی برادریوں کے خلاف ادارہ جاتی امتیاز پر بھی گہری تشویش ظاہر کی گئی ہے، اور نفرت انگیز تقاریر میں اضافے کے ساتھ ساتھ ہندو دائیں بازو کے گروہوں کو عملی طور پر استثنا حاصل ہونے کے رجحان کی نشاندہی کی گئی ہے۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر بھی کئی ریاستوں میں مسلمانوں کے مذہبی معمولات کو نشانہ بنایا گیا، جہاں مختلف ریاستی وزرائے اعلیٰ کی جانب سے قربانی اور عوامی مقامات پر نماز کے حوالے سے وارننگز جاری کی گئیں اور بعض عدالتی فیصلوں میں بھی مذہبی رسوم پر تحفظات کا اظہار کیا گیا۔ اسی طرح دہرادون میں ایک مسجد پر پابندی کے بعد مقامی انتہاپسند عناصر کی جانب سے اس کے باہر ہندو مذہبی رسومات شروع کیے جانے کا واقعہ بھی سامنے آیا، جس نے مقامی سطح پر شدید کشیدگی پیدا کی۔

جمہوریت اور اقلیتوں کے حقوق: ایک گہری تشویش:

یہ تمام واقعات عبادت گاہوں اور مدارس کا بلا نوٹس انہدام، وقف املاک پر قانونی شکنجہ، نفرت انگیز بیانات اور ہجومی تشدد پر مؤثر کارروائی کا فقدان ایک ایسے مجموعی نمونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کسی جمہوری ملک کی آئینی اقدار سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آئینِ ہند مذہبی آزادی، قانون کے سامنے مساوات اور اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، لیکن زمینی حقائق بتاتے ہیں کہ یہ ضمانتیں عملی سطح پر کمزور پڑ رہی ہیں۔ عدالتی مداخلتیں بعض مواقع پر راحت کا باعث ضرور بنی ہیں، تاہم انہدامی کارروائیوں کی رفتار اور وسعت اس بات کی متقاضی ہے کہ نہ صرف بھارتی سول سوسائٹی اور میڈیا بلکہ عالمی برادری بھی اس صورتحال پر سنجیدہ توجہ دے۔ ایک جمہوریت کی اصل پہچان اکثریت کی حکمرانی سے کہیں زیادہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ میں ہوتی ہے، اور بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا جانے والا یہ سلوک اس امتحان میں بھارتی ریاست کی ناکامی کی عکاسی کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قانون کی حکمرانی بحال کی جائے، انہدامی کارروائیوں میں مناسب قانونی طریقہ کار اور نوٹس کو یقینی بنایا جائے، اور نفرت انگیز بیانات دینے والوں کے خلاف بلا امتیاز کارروائی عمل میں لائی جائے، تاکہ بھارت کی کروڑوں مسلم آبادی وقار اور تحفظ کے ساتھ زندگی گزار سکے۔

□□□

کیا آپ بھی انٹرنیٹ اور موبائل کو صرف تفریح اور وقت گزاری کے لیے استعمال کرتے ہیں؟
تو آیئے! اسی موبائل اور لیپ ٹاپ کو ہنر، علم اور حلال پارٹ ٹائم آمدنی کا ذریعہ بنائیں!
صفحات: +240
قیمت: 250روپے
مطالعہ کیجئے ہماری کتاب رزق کے نئے راستے کا

جس میں 200 سے زائد صفحات پر 100 سے زائد عملی آن لائن کمائی کے طریقے آسان اردو میں بیان کیے گئے ہیں۔
آن لائن قرآن و عربی تدریس، فری لانسنگ، Fiverr، Upwork، YouTube، سوشل میڈیا، گرافک ڈیزائننگ، ویڈیو ایڈیٹنگ، AI/ChatGPT، آن لائن کورسز اور آن لائن فراڈ سے بچاؤ سمیت بہت سے اہم موضوعات شامل ہیں۔
مصنف: احمد رضا صابری (ایم اے ان ماس میڈیا)
کاپیاں محدود ہیں! اپنا آرڈر آج ہی بک کرائیں۔
مزید جانکاری کے لیے واٹس ایپ کریں: 8521889323

اتراکھنڈ: مذہبی تعلیم کا مستقبل اور خدشات!!

غلام مصطفیٰ نعیمی ہاشمی، روشن مستقبل دہلی

مدارس میں عموماً انہیں طلبہ کی اکثریت ہوتی ہے جو حفظ و قرأت اور درس نظامی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں. تفسیر و حدیث اور فقہ و افتا کے فاضلین بنائے جاتے ہیں. لیکن مذکورہ اتھارٹی کے بعد یہ سارا نصاب پڑھانا ناممکن ہو جائے گا. وقت رہتے اس مسئلے کا قانونی حل نہیں تلاشا گیا تو یہی تجربہ ملک کی دیگر ریاستوں میں بھی اختیار کیا جائے گا. اس وقت بی جے پی اکیس ریاستوں میں حکومت کر رہی ہے.

اتراکھنڈ میں تیس جون 2026 کو مدرسہ بورڈ کو آفیشیلی ختم کر دیا گیا۔ اس کی جگہ "اتراکھنڈ اقلیتی تعلیمی اتھارٹی" کی تشکیل دی گئی ہے۔ حکومتی آرڈر کے مطابق اب بغیر اس اتھارٹی کے منظوری کے کوئی بھی مدرسہ نہیں چلایا جا سکتا۔ خلاف ورزی کی صورت میں قانونی کاروائی کی جائے گی۔

مدرسہ بورڈ کا فائدہ؟

اتراکھنڈ میں سال 2016 میں کانگریس کی ہریش راوت حکومت نے اقتدار کے آخری دور میں مدرسہ بورڈ کی تشکیل کی تھی۔ جس کا مقصد یوپی بہار وغیرہ کی طرز پر مذہبی اداروں کو حکومتی امداد اور ان کی اسناد کو قانونی درجہ دینا تھا۔ حالانکہ اپنی مدت کے اختتام تک کانگریس حکومت یہ دونوں ہی کام نہیں کر پائی اور سال 2017 میں بی جے پی حکومت برسر اقتدار آ گئی۔ تب سے اب تک وہی اقتدار میں ہے۔ ان نو سالوں میں مدرسہ بورڈ شوپیس بنا رہا۔ مدارس کو حکومتی امداد ملی نہ ہی مدرسہ بورڈ کی جاری کردہ اسناد کو قانونی حیثیت ہی مل سکی۔ اس طرح مدرسہ بورڈ سفید ہاتھی کی شکل میں رہا۔ جس کا اہل مدرسہ کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مدرسہ بورڈ سے جاری مولوی، عالم فاضل کی اسناد کو ملک تو کجا اتراکھنڈ میں بھی کسی بورڈ/ یونیورسٹی سے منظوری نہیں ملی۔ اب جب کہ بی جے پی حکومت اپنا دوسرا ٹرم پورا کرنے جا رہی ہے تو اس نے مدرسہ بورڈ کو تحلیل کر کے ایک ایسا راستہ کھول دیا ہے جو مذہبی تعلیم کو سخت نقصان پہنچانے والا ہے۔

نئی اتھارٹی اور خدشات

اتراکھنڈ سے آسام اور یوپی میں مدرسہ بورڈ کو ختم کیا گیا تھا۔ آسام میں یہ کام براہ راست حکومت نے قانون سازی کے ذریعے کے ذریعے کیا جب کہ یوپی میں یہ کام ایک سوشل کم سیاسی ورکر کی درخواست پر یوپی ہائی کورٹ کے فیصلے سے ہوا۔ دونوں ہی فیصلوں کا محور امداد یافتہ مدارس تھے۔ دونوں جگہ ایک ہی بنیادی سبب بتایا کہ سیکولر ملک میں مذہبی تعلیم کے لیے حکومتی بجٹ جاری نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں ہی صوبوں کا معاملہ سپریم کورٹ میں پہنچا جہاں یوپی والوں کو اسٹے کی شکل میں جزوی راحت ملی جب کہ آسام والوں کی شنوائی جاری ہے۔ غالباً انہیں دو تجربات کے بعد اتراکھنڈ حکومت نے براہ راست مدرسہ بورڈ ختم کرنے کی بجائے متبادل اتھارٹی بنانے کا راستہ اختیار کیا، تاکہ بات کورٹ تک پہنچے تو یہ کہ کر دفاع کیا جا سکے کہ

ہم نے کسی کا حق نہیں چھینا بل کہ دیگر اقلیتوں کو بھی شامل کر کے نیا بورڈ/ اتھارٹی بنادی ہے تا کہ اس کا فائدہ سبھی اقلیتی قوموں کو حاصل ہو۔

مذکورہ تعلیمی اتھارٹی سے سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کے دائرے میں تمام مذہبی اداروں کو شامل کر لیا گیا ہے۔ چاہے وہ سابقہ بورڈ سے منظور شدہ ہوں، یا مسلمانوں کی ذاتی رقم سے چلنے والے مکاتب و مدارس۔ اب ہر مذہبی ادارے کو مذکورہ اتھارٹی سے منظوری لینا لازمی ہے۔ خلاف ورزی کو جرم بنا دیا گیا ہے۔ اتھارٹی کا یہی غیر معمولی اختیار سب سے زیادہ پریشان کن ہے۔ یہ اختیار براہ راست دستور ہند کے بنیادی حقوق کی دفعہ (1)30 کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ دفعہ (1)30 کے تحت ہر مذہبی کمیونٹی کو اپنی زبان کے مطابق مذہبی تعلیمی ادارے قائم کرنے کا قانونی حق حاصل ہے:

"All minorities, whether based on religion or language, shall have the right to establish and administer educational institutions of their choice"

(constitution of India page 14)

"تمام اقلیتوں کو، چاہے وہ مذہب کی بنیاد پر ہوں یا زبان کی بنیاد پر، یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کریں اور ان کا انتظام کریں۔"

اس دفعہ کے مطابق مذہبی اداروں کا "قیام اور انتظام" اقلیتوں کا بنیادی حق ہے۔ لیکن مذکورہ اتھارٹی اس دستوری حق میں واضح طور پر دخل اندازی کرتی نظر آرہی ہے۔

- اتھارٹی میں چیئرمین سمیت کل گیارہ ارکان رکھے گیے ہیں جس میں پانچ ارکان حکومتی افسر ہوں گے۔ پانچ ارکان سکھ، عیسائی، جین، بودھ اور پارسی سماج سے جب کہ ایک نمائندہ مسلم قوم سے شامل رہے گا۔
- ہر ادارے کو دہری منظوری لینا ہوگی۔ پہلے صوبائی ایجوکیشنل بورڈ سے بعدہ اقلیتی تعلیمی اتھارٹی سے۔
- صبح سے دوپہر تک این سی ای آر ٹی کا اسکولی نصاب پڑھایا جائے گا۔ اس وقت میں مذہبی تعلیم بالکل نہیں دی جائے گی۔
- دوپہر کے بعد دی جانے والی مذہبی تعلیم کا نصاب بھی یہی اتھارٹی طے کرے گی۔ فی الحال اتھارٹی نے مذہبی تعلیم کے لیے جو نصاب مقرر کیا ہے وہ یہ ہے:
- کلمہ خوانی
- ناظرہ قرآن

پہلی کلاس سے آٹھویں کلاس تک صرف اتنی ہی تعلیم دی جائے گی۔ آٹھویں سے بارہویں کا نصاب ابھی جاری نہیں کیا گیا ہے۔

- مذکورہ نصاب بھی اختیاری ہے، لازمی نہیں ہے۔
- اتھارٹی سے منظوری کے لیے ادارے کے پاس رجسٹرڈ سوسائٹی/ٹرسٹ ہو اور زمین کی ملکیت اسی سوسائٹی/ٹرسٹ کے نام درج ہو۔

غور کریں!

مذکورہ شرائط کس قدر خطرناک اور پریشان کن ہیں۔ کیا ان شرائط کے ہوتے ہوئے مذہبی ادارے اپنی روح کو باقی رکھ سکتے ہیں؟

نزاکت کو سمجھیں!

مدارس میں عموماً انہیں طلبہ کی اکثریت ہوتی ہے جو حفظ و قرأت اور درس نظامی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تفسیر و حدیث اور فقہ و افتا کے فاضلین بنائے جاتے ہیں۔ لیکن مذکورہ اتھارٹی کے بعد یہ سارا نصاب پڑھانا ناممکن ہو جائے گا۔ وقت رہتے اس مسئلے کا قانونی حل نہیں تلاشا گیا تو یہی تجربہ ملک کی دیگر ریاستوں میں بھی اختیار کیا جائے گا۔ اس وقت بی جے پی اکیس ریاستوں میں حکومت کر رہی ہے۔

ذرا سوچ کر دیکھیں!!

اگر جامعہ اشرفیہ مبارک پور، منظر اسلام بریلی، جامعہ نعیمیہ مرادآباد، دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی اور جامعہ امجدیہ گھوسی جیسے اداروں کو صرف ناظرہ قرآن تک محدود کر دیا جائے تو ملت کا حال کیا ہوگا؟

اگر ہم نے وقت رہتے اس معاملے کی نزاکت و حساسیت کو نہیں سمجھا تو یہی کھیل پورے ملک میں کھیلا جائے گا۔ اور ملت کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا کہ آنے والی نسلوں کو قرآن و حدیث کے مسائل بتانے والا عالم ملے گا نہ صحیح طریقے سے نماز پڑھانے والا امام!

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

□□□

بہار میں مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں کی روک تھام: تفتیش کے نام پر انسانی المیہ

احمد رضا صابری (ڈائریکٹر احمد پبلیکیشنز، پٹنہ)

"۔۔۔ایک استاذ کا بیان ہے کہ وہ قرض لے کر گھر چلا رہا ہے اور قرض خواہوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔ بچوں کی بیماریوں کا علاج معطل ہے، کچھ نے اپنے بچوں کو اسکول سے نکال دیا ہے۔ خواتین اساتذہ خاص طور پر متاثر ہیں کیونکہ وہ اکثر خاندان کی واحد آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ تنظیمیں بتاتی ہیں کہ بہت سے اساتذہ ٹیوشن دے کر یا روزگار کی تلاش میں گھوم رہے ہیں، لیکن مہنگائی کے اس دور میں یہ ناکافی ہے۔ یہ صورتحال نہ صرف انفرادی تکلیف ہے بلکہ تعلیمی نظام پر منفی اثر ڈال رہی ہے کیونکہ پریشان حال استاذ کلاس میں پوری توجہ نہیں دے سکتا۔۔۔"

بہار ریاست میں حکومت کے زیر امداد یافتہ مدارس اور سنسکرت اسکولوں کے ہزاروں اساتذہ وملازمین گزشتہ چھ سات ماہ سے تنخواہوں کے بغیر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ محض انتظامی تاخیر نہیں بلکہ ایک گہرے سماجی اور اقتصادی بحران کی شکل اختیار کر چکا ہے، جس میں غریب اساتذہ کے خاندان روزمرہ کی بنیادی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ اس بحران کے اسباب، تفتیش کے عمل کی مناسبت، متاثرہ خاندانوں کی حالت زار اور عدالتی پس منظر کئی طرح کے سوالات کھڑے کیے جا رہے ہیں۔

تفتیش کا پس منظر اور موجودہ صورتحال

جون 2026 میں بہار کے محکمہ تعلیم نے ریاست بھر میں غیر سرکاری تسلیم شدہ امداد یافتہ مدارس اور سنسکرت اسکولوں کی جامع جسمانی تصدیق (physical verification) کا حکم جاری کیا۔ تقریباً 1,942 امداد یافتہ مدارس اور 600 سے زائد سنسکرت اسکول اس عمل کے دائرے میں آئے۔ بلاک سطح پر تین رکنی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں جن میں بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر، سرکل آفیسر اور سرکاری اسکول کے سینئر ہیڈ ماسٹر شامل تھے۔ ان کمیٹیوں کو عمارتوں کی حالت، اساتذہ کی حاضری، تقرری کے ریکارڈ، طلبہ کی تعداد، کلاس روم سرگرمیاں اور گرانٹ کے استعمال کا جائزہ لینے کی ہدایت کی گئی۔

اس تفتیش کے نام پر تنخواہوں کی ادائیگی روک دی گئی۔ اساتذہ تنظیمیں، بشمول مدرسہ ٹیچرز اینڈ ویلفیئر ایسوسی ایشن، بتاتی ہیں کہ انکوائری دو ماہ قبل مکمل ہو چکی تھی لیکن ادائیگی ابھی تک نہیں ہوئی۔ اگست 2026 تک یہ تاخیر پانچ سے سات ماہ تک پہنچ چکی تھی۔ حالیہ پیش رفت میں تعلیم وزیر متھلیش تیواری نے افسران کے ساتھ اجلاس میں 5 ستمبر 2026 تک بقایا تنخواہوں کی ادائیگی کا حکم دیا اور ای-شکشا کوش پورٹل پر درخواستیں جمع کرانے کی ہدایت کی۔

حزب اختلاف کے رہنما تیجسوی یادو نے وزیر اعلیٰ سمراٹ چودھری کو خط لکھ کر فوری ادائیگی کا مطالبہ کیا اور کہا کہ تنخواہ نہ ملنے سے خاندانوں کی تعلیم، علاج اور روزمرہ کے اخراجات متاثر ہو رہے ہیں۔ جے ڈی یو کے رہنماؤں نے بھی اسی طرح کی اپیلیں کیں۔

تفتیش کے نام پر تمام تنخواہیں روکنا کتنا مناسب؟

کاغذات اور حقیقت کی تصدیق ضروری ہے تاکہ سرکاری فنڈز کا غلط استعمال نہ ہو، فرضی تقرریاں سامنے آئیں اور معیاری تعلیم یقینی بنائی جا سکے۔ بہار میں ماضی میں کچھ مدارس کے بارے میں شکایات سامنے آتی رہی ہیں کہ وہ معیارات پر پورا نہیں اترتے یا ریکارڈ میں خامیاں ہیں۔ تاہم، تمام اساتذہ کی تنخواہیں یکساں طور پر روک دینا انصاف کے اصولوں کے خلاف ہے۔ جو اساتذہ باقاعدگی سے فرائض سرانجام دے رہے ہیں، ان کی تنخواہ روکنا انہیں سزا دینے کے مترادف ہے۔ تفتیش مکمل ہونے کے بعد بھی مہینوں کی تاخیر انتظامی ناکامی کی نشاندہی کرتی ہے۔

عدالتی اصولوں کے مطابق، اگر کسی ادارے میں بے ضابطگی پائی جائے تو مخصوص مقدمات میں کارروائی ہونی چاہیے، نہ کہ تمام ملازمین کو اجتماعی طور پر متاثر کیا جائے۔ اساتذہ کا کہنا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں لیکن ان کے خاندان بھوک اور قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ تفتیش کو تیز اور منصفانہ طریقے سے مکمل کر کے فوری ادائیگی کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

متاثرہ اساتذہ اور ان کے خاندانوں کی حالت زار

بہار کے اکثر امداد یافتہ مدارس کے اساتذہ غریب پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تنخواہیں پہلے ہی محدود ہوتی ہیں (بنیادی تنخواہ تقریباً 21,000 سے 23,000 روپے کے قریب، الاؤنسز کے بغیر)۔ چھ سات ماہ کی تنخواہ نہ ملنے سے بہت سے خاندان قرض کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ روزمرہ کے کھانے، بچوں کی اسکول فیس، ادویات اور کرایہ ادا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔

ایک استاذ کا بیان ہے کہ وہ قرض لے کر گھر چلا رہا ہے اور قرض خواہوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔ بچوں کی بیماریوں کا علاج معطل ہے، کچھ نے اپنے بچوں کو اسکول سے نکال دیا ہے۔ خواتین اساتذہ خاص طور پر متاثر ہیں کیونکہ وہ اکثر خاندان کی واحد آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ تنظیمیں بتاتی ہیں کہ بہت سے اساتذہ ٹیوشن دے کر یا روزگار کی تلاش میں گھوم رہے ہیں، لیکن مہنگائی کے اس دور میں یہ ناکافی ہے۔ یہ صورتحال نہ صرف انفرادی تکلیف ہے بلکہ تعلیمی نظام پر منفی اثر ڈال رہی ہے کیونکہ پریشان حال استاذ کلاس میں پوری توجہ نہیں دے سکتا۔

عدالتی نگرانی میں سابقہ جانچ اور نئی تفتیش کا معمہ

تقریباً ایک سال یا اس سے کچھ پہلے پٹنہ ہائی کورٹ کی نگرانی میں بہار کے مدارس کی جانچ ہوئی تھی۔ خاص طور پر Alauddin.Md Bismil وغیرہ کے مقدمات میں عدالت نے 2459+1 کیٹیگری کے مدارس کی حیثیت کی تصدیق کا حکم دیا تھا۔ تین رکنی ہائی لیول کمیٹی نے جانچ کی، کچھ مدارس کے لیے منظوری کی سفارش کی گئی جبکہ کچھ کی منظوری منسوخ کرنے کی سفارش ہوئی۔ عدالت نے اس عمل پر اطمینان کا اظہار کیا اور کچھ معاملات میں تنخواہوں کی ادائیگی جاری رکھنے یا بحال کرنے کے احکامات دیے۔ 2025 میں کچھ مدارس کو گرانٹ دوبارہ ملنے لگی۔

پھر 2026 میں نئی حکومت کے تحت دوبارہ ریاست گیر فیزیکل تصدیق کا حکم جاری ہوا۔ سوال یہ ہے کہ ایک سال کے اندر دوبارہ مکمل تفتیش کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ سابقہ عدالتی عمل کے نتائج کو مکمل طور پر نافذ کیوں نہیں کیا گیا؟ اگر کچھ بے ضابطگیاں باقی تھیں تو مخصوص اداروں پر کارروائی کی جا سکتی تھی۔ نئی تفتیش نے تنخواہوں کو روک کر اساتذہ کو دوبارہ مشکلات میں ڈال دیا۔ حزب اختلاف نے بھی پوچھا کہ پچھلی سروے کی سفارشات پر عمل درآمد ہوا یا نہیں۔

یہ بار بار کی تفتیشیں اعتماد کو کمزور کرتی ہیں اور یہ تاثر دیتی ہیں کہ انتظامی عمل سست اور غیر مؤثر ہے۔ عدالت نے پہلے ہی نگرانی کی تھی، اس کے بعد نئی تاخیر غیر ضروری لگتی ہے۔

کاغذات کی تفتیش ضروری ہے لیکن اس کے نام پر ہزاروں غریب اساتذہ کے خاندانوں کو مہینوں تک بھوک اور قرض میں مبتلا کرنا مناسب نہیں۔ حکومت کو فوری طور پر بقایا تنخواہیں جاری کرنی چاہئیں، تفتیش کے نتائج شفاف طریقے سے سامنے لانے چاہئیں اور مستقبل میں ایسے بحران سے بچنے کے لیے باقاعدہ نگرانی کا نظام بنانا چاہیے۔ ای-پورٹل پر ڈیٹا اپ ڈیٹ کرنا اچھا قدم ہے لیکن اس کے ساتھ بروقت ادائیگی بھی یقینی بنانی چاہیے۔

اساتذہ کی آواز سنی جائے، ان کے خاندانوں کی تکلیف کو انسانی بنیاد پر دیکھا جائے۔ تعلیم کا نظام تب ہی مضبوط ہوگا جب اساتذہ کو اطمینان اور معاشی تحفظ حاصل ہو۔ بہار حکومت سے توقع ہے کہ 5 ستمبر کی ڈیڈ لائن پر عمل کرتے ہوئے اس المیے کو ختم کرے گی۔

□□□

AL-RAZA International (Bimonthly)
Printed by: Ahmad Publications Pvt. Ltd. Qadri Manzil
Opp. Patna Collegiate School, Baripath, Patna, Bihar (India) 800004

برائے ایصال ثواب

مرحوم محمد مقیم ابن عبدالعلیم سیٹھ
فروٹ مرچنٹ شطرنجی پورہ ناگپور

خداوند قدوس مرحوم محمد مقیم کے ذخیرہ حسنات قبول فرمایے اس ذریعہ اشاعت دین کو
ان کے لیے کفارۂ سیئات بنایے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمایے آمین!

منجانب
محمد توصیف رضا

M MS MOH MUKEEM & SONS
FRUIT COMMISSION AGENT & ORDER SUPPLIER
HALL NO. 2, SHOP NO. A/14, NEW KALAMNA
MARKET, NAGPUR - 440008 (M.S)

القلم فاؤنڈیشن، پٹنہ کی درسی مطبوعات

- نوائے عارفاں
- فارسی کی پہلی
- تسہیل المصادر
- گلزار دبستاں
- چہل حدیث
- سچی نماز
- دستور ہند کی تدریس
- منہاج العربیہ (اول۔دوم)
- میزان ومنشعب
- اسلام اور پردہ

القلم کی زیر طبع درسی کتابیں

- تاریخ اسلام کی تدریس
- گلستاں (پہلا اور آٹھواں باب: مع مشقی سوالات)
- فیض الادب (اول۔دوم)
- سیرت رسول کرم
- قصد الصیغہ

Printed at: **Ahmad Publications Pvt. Ltd.** Patna #8521889323